رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد، رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا، اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

ضخامت ۶۰۲ صفحات مجلد نو روپیہ لعہ علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
کا
مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے :۔ اصحاب کہف معجزہ و کرامت انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل طوفان نوح خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس ورہان ہی حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۳۲ صفحات کاغذ سفید، قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ ۸؍

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیال اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئیگا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں
اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

ترغیبات جنسی یا
شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

نہایت ضروری اطلاع

چونکہ رجسٹری کی فیس اب چھ آنے ہوگئی ہے، اس لئے "نگار" کا سالانہ وی پی آٹھ روپیہ چھ آنے کے بجائے آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں روانہ ہوگا۔ آپ اس نقصان سے اس طرح بچ سکتے ہیں کہ سالانہ چندہ آٹھ روپے ذریعہ منی آرڈر روانہ فرمائیں۔ منیجر

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۳ | فہرست مضامین اپریل سنہ ۵۳ء | شمارہ ۴

ملاحظات ۔۔۔۔۔۔ ۱
مولانا شبلی کی شخصیت ۔۔۔ مفتون احمد ۔۔۔ ۶
داغ اور بہار ۔۔۔ پروفیسر ذکی اختر ہاشمی ۔۔۔ ۱۳
فن کیا ہے؟ ۔۔۔ سید محمد عقیل ۔۔۔ ۲۰
مومن کا فارسی کلام ۔۔۔ جوہر ٹونکی ۔۔۔ ۲۴
زہریلی عورتیں ۔۔۔ محمد اسحاق صدیقی ۔۔۔ ۳۱
کچھ داغ کے متعلق ۔۔۔ امتیاز علی خاں عرشی ۔۔۔ ۳۴
عہد حاضر کی فلک پیمائیاں ۔۔۔ ۴۳
میرزا غالب نقاد کی حیثیت سے ۔۔۔ غلام رسول مہر ۔۔۔ ۴۵
صبح کاذب (نظم) ۔۔۔ فضا ابن فیضی اعظمی ۔۔۔ ۴۹
مطبوعات موصولہ ۔۔۔ ۵۱/۵۶

(داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہوگیا۔ مئی کا پرچہ ذریعہ وی، پی ۸/۷ روپیہ میں روانہ ہوگا۔ آپ کا فایدہ اسی میں ہے کہ چندہ ۸/= روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ کریں)

ملاحظات

ایک پاکستانی دوست کا خط اور اُس کا جواب

افسوس ہے کہ پرچہ کے آخری جزو کی کتابت کے بعد یہ خط پہونچا، اس لئے "باب المراسلات" کی جگہ مجبوراً "ملاحظات" کے تحت شایع کیا جاتا ہے۔

کراچی - ۲۵ مارچ سنہ ۵۳ء

قبلہ! سلام مسنون

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ "نگار" کا تازہ پرچہ وصول ہوا۔ آپ نے پاکستان کی نسبت جن تاثرات کا اظہار فرمایا ہے وہ کئی پہلوؤں سے بے حد خیال انگیز ہیں۔ آپ نے صحیح لکھا ہے کہ موجودہ حالات میں ہندوستان اور پاکستان کے لئے بہترین طریق کار یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ یقین کیجئے کہ ہماری حکومت کی پالیسی اور نصب العین یہی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے عظیم ہمسایہ ملک نے اس سلسلے میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ بہرحال یہ ایک طویل مبحث ہے۔ جس پر اخباری کالموں میں بحث

کی جا سکتی ہے! آپ نے اینٹی احمدی تحریک کے حالات اخبارات میں پڑھ لئے ہوں گے۔ کراچی میں تو یہ فلیتہ سلگ کر ہی فش ہوگیا۔ (اب تک تو یہی محسوس ہوتا ہے آگے کی خبر نہیں) لیکن لاہور میں عوام کی بے اطمینانی، بدگمانی اور بیزاری کا "جوالا مکھی" پوری طاقت سے پھٹا۔ بڑے تباہ کن نتائج نکلے۔ خیر اچھا ہوا کہ دلوں کا بخار نکل گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لاہور کے حوادث کا پس منظر کیا ہے؟ لیکن ظاہر ہے کہ یہ باتیں زبان پر لانے کی نہیں ہیں۔ بہرحال لوگوں کو مرکزی حکومت کی طاقت کا اندازہ ہوگیا اور یہ بڑی اہم چیز ہے۔ اس اندازے کے نفسیاتی اثرات بہت وسیع اور عمیق ہوں گے۔

میرے خیال میں اس شر سے خیر کا ایک نیا پہلو پیدا ہوا ہے اور میں نے ..... اپنے اولیائے امور کی توجہ صورت حال کے اس پہلو کی طرف مبذول کرائی ہے۔ لطیفہ یہ ہوا ہے کہ اینٹی احمدی تحریک کے سلسلہ میں علمائے اسلام (کثر اللہ امثالہم؟) کی معقول اکثریت جیل چلی گئی ہے۔

وہ میرا ذکر بھی کچھ اس ادا سے کرتے ہیں
کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

حضرت مولانا عبدالحامد قادری البدایونی سے لیکر مولوی ابوالحسنات تک جتنے بزرگان دین تھے وہ خوبیِ تقدیر سے بندی خانے پہونچ گئے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ ہم ۱۹۵۴ء تک ان کی زیارت سے محروم رہیں گے تعجب نہیں کہ میعاد اسیری میں ایک سال کا اضافہ اور ہو جائے۔ حکومت پاکستان کا فرض ہے کہ ۔۔ "فرصت اگرت دست دہد مغتنم انگار" کے پیش نظر وہ اس مدت میں تمام بنیادی امور کو نپٹا دے۔ یعنی دستور سازی۔ نفاذ دستور اور عمومی انتخابات وغیرہ۔ قبلہ! انصاف کیجئے کہ حالات کا یہ پہلو کس قدر دلچسپ اور کتنا فرح بخش ہے؟ یعنی اندازہ فرمائیے کہ مجلس دستور ساز، جو ملاحدہ و زنادقہ پر مشتمل ہے، ٹھاٹ سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا دستور بنا رہی ہوگی اور مولوی جیل میں پڑے ایڑیاں رگڑ رہے ہوں گے۔

کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

بے شک اس تحریک کے سلسلہ میں مولوی مودودی ایسی "سمجھدار مچھلی" ثابت ہوئے جو مچھیرے کی آمد سے ایک روز قبل ہی گھاٹ سے بہ کر گہرے پانی میں چلی گئی تھی۔ مگر ان کا "نہ پکڑا جانا" ان کی مولویت اور پیرزادگی کے لئے تباہ کن ثابت ہوا کیونکہ جب اونٹ کی واحد شناخت "نکیل" قرار پا جائے تو جس اونٹ کی ناک میں نکیل نہ ہو اُسے کون اونٹ تسلیم کرے گا؟ آج سچا مولوی وہ ہے جو اینٹی احمدی تحریک کے سلسلہ میں پکڑا گیا ہو۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مولوی مودودی کی مولویت ختم ۔۔ کیونکہ انھوں نے عوام کو صرف ایک بیان پر ٹرخا دیا۔

مخلص

....

لکھنؤ - ۲۵ مارچ ۵۳ء

تسلیم -

کل آپ کا نوازش نامہ ملا تو بے اختیار آپ سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگا۔ کراچی کے دورانِ قیام میں جب کبھی آپ سے ملاقات ہوتی تھی تو موضوع گفتگو ہمیشہ "پاکستان" ہی ہوا کرتا تھا، اس لئے اب جو کئی ماہ کے بعد آپ کا خط ملا تو کراچی کی وہی صحبتیں نظروں میں پھرنے لگیں اور وہی "حدیثِ دوست" سامنے آگئی جس سے ہم آپ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ جواب لکھنے بیٹھا تو خلاف توقع "سِرّ دلبراں" ہو کر رہ گیا اور اس کا لطف اسی میں ہے کہ "گفتہ آید در حدیثِ دیگراں"۔ اس لئے آپ کا خط اور اپنا جواب دونوں نگار میں شایع کرتا ہوں۔

خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم!

ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی پالیسی اور اس کا نصب العین یہی ہو کہ وہ ہندوستان سے تعلقات خوشگوار رکھے اور آپ

فرماتے ہیں تو یقیناً ایسا ہی ہوگا، لیکن میرے عزیز دوست، پالیسی یا نصب العین، محض خواہش و تمنا کا نام نہیں اور نہ اس کا واسطہ Arm chair Politics سے ہے - یہ چیز تو بالکل حرکت و عمل سے تعلق رکھتی ہے - اور - اگر نوابزادہ کی رحلت کے بعد کوئی اقدام اس نوعیت کا پاکستان کی طرف سے ہوا ہو تو میں اس کے سننے کا مشتاق ہوں!

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اس سلسلہ میں ہندوستان نے البتہ کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا" یہ سنکر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ معاہدۂ "تاجنگی" کی پیشکش اور قانون تخلیہ کنندگان کو یک لخت ختم کردینے کی تجویز غالباً سب سے پہلے نہرو کی طرف سے کی گئی تھی جسے پاکستان نے شاید مذاق سمجھ کر ٹال دیا، حالانکہ پاکستان کے سامنے یہ ایسا Sporting offer تھا کہ اگر موقع شناسی سے کام لیا جاتا تو اس مذاق سے بھی بڑا فایدہ اُٹھایا جاسکتا تھا، لیکن جناب ڈاکٹر قریشی نے اس کے جواب میں (اور وہ بھی کافی تاخیر کے بعد) جو کچھ فرمایا اس کی روح یہ تھی کہ "پہلے ہندوستان قانون تخلیہ کنندگان کو منسوخ کردے، اس کے بعد پاکستان غور کرے گا کہ وہ کیا کرسکتا ہے!"

قربانِ نگاہِ تو شوم باز نگاہ ہے!

تھوڑی دیر کے لئے میں مانے لیتا ہوں کہ نہرو کی یہ پیشکش بالکل Bluff تھا، لیکن Bluff کا جواب Bluff سے دینا بڑی گھٹیا درجہ کی سیاست ہے۔ بلند سیاست کا اقتضا یہ تھا کہ پاکستان بالکل غیر مشروط طور پر اپنے قانون تخلیہ کنندگان کو منسوخ کردیتا اور ہندوستان سے کسی متوازی اقدام کی درخواست بھی نہ کرتا۔ اگر نہرو کا یہ پیشکش Bluff تھا تو اسے صرف اسی طرح بے نقاب کیا جاسکتا تھا۔

"معاہدۂ تاجنگی" کے سلسلہ میں پاکستان نے اس وقت تک جو کچھ کیا وہ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر اس کی پالیسی واقعی صلح جوئی پر مبنی ہے، جیسا آپ فرماتے ہیں، تو کیا پاکستان کو اس پیشکش کا جواب خاموشی سے دینا چاہئے تھا؟ — اس کا جواب ایک ہی تھا اور وہ بھی صرف ایک ہی لفظ کا کہ — "بسم اللہ"! لیکن افسوس ہے کہ پاکستان میں سب سے زیادہ کمی خود اعتمادی کی ہے اور یہی کمی اُسے کسی مسئلہ میں کوئی مضبوط قدم اُٹھانے نہیں دیتی۔

آپ کا یہ ارشاد کہ ہندوستان نے پاکستان سے خوشگوار تعلقات قایم کرنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، غالباً ان چند الزامات کی بنا پر ہے جو ہندوستان پر عاید کئے جاتے ہیں۔ آئیے اک نگاہ ان پر بھی ڈال لیں۔ سب سے بڑا الزام نہروں کی آبرسانی سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مشرقی پنجاب کی طرف سے مغربی پنجاب کی نہروں میں پانی بہت کم آیا لیکن اس کا سبب یہ قرار دینا کہ ہندوستان نے پاکستان میں خشک سالی پیدا کرنے کے لئے ارادتاً ایسا کیا، بڑا عاجلانہ فیصلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے سال بارش کی کمی کی وجہ سے دریاؤں کی سطح معمول سے بہت نیچی رہی یہاں تک کہ خود مشرقی پنجاب کی نہروں میں بھی پانی بہت کم آیا، جس کی تصدیق حال ہی میں ایک غیر جانبدار ماہر فن نے بھی کی ہے۔

بات یہ ہے کہ غلہ کی کمی کا سوال حکومتوں کے لئے بڑا اہم سوال ہوا کرتا ہے اور عوام کی بے چینی و بدظنی دور کرنے کے لئے وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی تاویل اس کی پیش کرتی رہتی ہیں اور اپنے سر سے الزام دور کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی سبب ایسا ضرور بتا دیتی ہیں جس کا تعلق بیرونی اسباب سے ہو۔ اور اس باب میں پاکستان نے بھی یہی کیا، ورنہ آپ مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ ہوں گے کہ پاکستان بھر کی تمام کھیتیاں پنجاب ہی کی نہروں سے سیراب نہیں ہوتیں — اور تھوڑی دیر کے لئے اس الزام کو صحیح مان لیا جائے، تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ جب پاکستان، ہندوستان کو اپنا دشمن باور کرتا ہے تو وہ کیوں اس سے رواداری یا پاس عہد کی توقع رکھے، یہ مشہور مصرعہ یقیناً آپ کی نگاہ سے گزرا ہوگا کہ:-

اے صدف تشنہ بمیرد سوئے نیساں منگر

بات کہنے کی نہیں لیکن کہنا پڑتی ہے کہ اگر مشرقی پنجاب کی تمام نہروں کا پانی صرف پاکستان ہی کے لئے مخصوص ہوتا تو بھی اسے انھیں

دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا، کیونکہ وہاں سوال در اصل پانی کا نہیں بلکہ "بمیر د تشنہ مستقی و دریا ہمچناں باقی" کا ہے۔

اس قسم کا دوسرا الزام تجارتی تعلقات کے سلسلہ میں ہندوستان پر یہ بھی عاید کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے یہاں جوٹ کی کاشت صرف اس غرض سے بڑھائی کہ پاکستان سے جوٹ لینے کی ضرورت اسے پیش نہ آئے!

گفتہ بودی ہمہ زر قند و فریب اند و فسوس
سعدی آں نیست ولیکن چو تو فرمائی ہست

اگر پاکستان کل اپنے یہاں لوہے کی کانوں سے لوہا نکالنا شروع کر دے اور ہندوستان یہ شکایت کرے کہ پاکستان نے یہ سب کچھ اس لئے کیا ہے کہ ہندوستان سے اسے لوہا خریدنا پڑے، تو دنیا کیا کہے گی، ستم ہے

ہم اگر کہدیں کوئی بات تو کافر کہلائیں
شیخ کہدے تو وہی بات کرامت ٹھیرے

باور کیجئے میرے دل میں بھی پاکستان کا درد اتنا ہی ہے جتنا آپ کے دل میں اور اگر آج میں پاکستان کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ہندوستان کی طرف سے ہر اقدام صلح کوشی کا پوری فراخدلی و خود اعتمادی کے ساتھ خیر مقدم کرے تو اس کا سبب صرف یہ ہے کہ میں ڈرتا ہوں مبادا کل یہ موقع بھی ہاتھ سے نکل جائے اور پاکستان کو اس سے زیادہ تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنا پڑے۔

میں نے جو کچھ عرض کیا، ممکن ہے اس سے آپ کو اختلاف ہو اور آپ اپنی تائید میں کچھ دلایل بھی پیش کر سکیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ ہندوستان کے مسایل پر غور کرتے ہیں، یہاں کی اقلیت کو سامنے رکھ کر اور میں پاکستان کے مسایل پر غور کرتا ہوں وہاں کی اکثریت کو سامنے رکھ کر، اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے ـــ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی بعض تنگ نظر جماعتیں بلکہ خود کانگرس پارٹی کے بھی اکثر افراد پاکستان کے دوست نہیں ہیں اور وہ اب تک غیر منقسم ہندوستان کا خواب دیکھ رہے ہیں اور جس حد تک جذبات و عمل کا تعلق ہے، ہندوستان یقیناً صحیح معنی میں نامذہبی حکومت نہیں ہے، لیکن یہ بھی ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جب تک ہندوستان کی حکومت نہرو کے ہاتھ میں ہے، پاکستان کو ہندوستان کی طرف سے مطمئن رہنا چاہئے اور یہی وہ نکتہ تھا جس کے پیش نظر میں نے یہ عرض کیا تھا کہ پاکستان کے لئے ہندوستان کے ساتھ مضبوط دوستانہ تعلقات پیدا کرنے کا بہترین وقت یہی ہے ـــ اگر آج دونوں حکومتیں اپنی اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ ایک دوسرے سے کبھی جنگ نہ کریں گی اور ایک نیوٹرل بلاک بنانے کے بعد مشترک دفاع کی اسکیم پر متحد ہو جائیں، تو کل ہندوستانی یا پاکستانی حکومتوں کے انقلاب کے بعد بھی اس رشتہ کا توڑنا آسان نہ ہوگا اور یہ تو آپ بھی مانتے ہیں کہ دونوں ملکوں کی بقا و ترقی کا انحصار صرف اس پر ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے دوست رہ کر شانہ سے شانہ ملا کر آگے بڑھیں ـــ اور یہ اتنا عظیم مقصد ہے کہ اگر اس کی تکمیل کی راہ میں بعض معمولی موانع حایل بھی ہوں تو انھیں نظر انداز کر دینا چاہئے ـ مستقبل کی تعمیر کے لئے حال کی ٹھوکروں کو برداشت کرنا ضروری ہے۔

اینٹی احمدی تحریک کے سلسلہ میں لاہور کے جس پس منظر کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے، وہ پردۂ راز کی چیز نہیں، سب کو اس کا علم ہو چکا ہے "آپ زبان پر لائیں یا نہ لائیں"۔ اس لئے مجھے کہنا پڑتا ہے کہ مرکزی حکومت نے طاقت سے کام لینے کے باوجود، کام ادھورا چھوڑ دیا، ضرورت تھی کہ اس سلسلہ میں سب سے پہلے انھیں پر ضرب لگائی جاتی جنھوں نے اس آگ کو اپنے دامن سے ہوا دی تھی ـ لیکن خیر، اب وزارت دولتانہ مستعفی ہو گئی ہے ممکن ہے حالات بہتر ہو جائیں

اس میں شک نہیں کہ احمدیوں کے خلاف پاکستان کے مسلمانوں نے جس درندگی و بربریت کا ثبوت دیا ہے وہ پاکستان و اسلام دونوں کی پیشانی پر نہ مٹنے والا داغ ہے اور ممکن ہے احمدی جماعت اسے بھلا دے لیکن تاریخ پاکستان کے صفحات سے خون کے یہ دھبّے کبھی نہیں مٹ سکتے۔

آج جو کچھ پاکستان کے مسلمانوں نے احمدی جماعت کے ساتھ کیا ہے، وہ علویئن کے ساتھ خوارج و زنادقہ نے بھی نہ کیا تھا۔ غضب خدا کا محض اکثریت سے ناجایز فایدہ اُٹھا کر دن دہاڑے بزدلانہ طریقہ سے احمدیوں کو قتل و ذبح کرنا، ان کی دوکانیں لوٹ لینا، مکانوں میں آگ لگا دینا، عورتوں کی

عصمت دری کرنا ـــ اور یہ سب کچھ خدا و رسول کے نام پر کرنا! معاذ اللہ! میں حیات بعد الموت اور جزا و سزا کا قایل نہیں، لیکن ان واقعات کو سُن کر بے اختیار جی چاہتا ہے کہ جنت نہ سہی لیکن کم از کم دوزخ پر ضرور ایمان لے آیا جائے کیونکہ ایسے کمینے، نابکار و نامراد وحشی انسانوں کی سزا و تعزیر کی کوئی معقول صورت میری سمجھ میں تو آتی نہیں ـــ یقیناً کراچی میں اس ہنگامہ نے زیادہ طول نہیں کھینچا اور ہو سکتا ہے کہ اس کا سبب یہی ہو کہ مولویوں کو حراست میں لے لیا گیا، علاوہ اسکے یوں بھی کراچی نہ احمدیوں کا مرکز ہے اور نہ انکے دشمنوں کا اڈا۔ اس لئے وہاں زیادہ شورش کی کوئی وجہ نہ تھی، لاہور میں صورتِ حالات اس سے بالکل مختلف ہے وہ احمدیوں کا بھی مرکز ہے اور احراریوں کا بھی، اور ان دونوں کے تعلقات عرصہ سے کشیدہ چلے آرہے ہیں ـ وہاں کے بعض اخبارات و رسایل کی زندگی کا مقصد بھی اس آگ کو مشتعل رکھنا ہے اور خود وہاں کی حکومت بھی غالباً سیاسی اغراض کی بنا پر کوئی نہ کوئی ہنگامہ چاہتی تھی، اس لئے وہاں جو کچھ ہوا وہ غیر متوقع بات نہ تھی، لیکن معاف کیجئے، ایک حد تک مرکز بھی اس کا ذمہ دار ہے کیونکہ اول اول جب مسئلۂ "ختم نبوت" کے سلسلہ میں اینٹی احمدی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اسی وقت مرکز کو مضبوط قدم اٹھا کر اس کا سدِّ باب کر دینا چاہئے تھا۔ کیا جن لوگوں کو آج گرفتار کیا گیا ہے، ان کو پہلے گرفتار نہ کیا جا سکتا تھا ـــ جس وقت حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ احمدی جماعت کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے، تو حکومت کے لئے دو ہی راستے تھے، ایک Dynamic دوسرا Academic یعنی یا تو وہ فوراً ان لوگوں کا منھ بند کر دیتی جنھوں نے یہ آواز بلند کی تھی، یا پھر یہ کہ احمدی و غیر احمدی علماء کو جمع کرکے ایک مجلسِ مناظرہ قایم کرنے کا مشورہ دیتی (جیسا کہ مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ میں کیا تھا) اور اس میں نہ صرف اس امر پر بحث کی جاتی کہ احمدی واقعی ختم نبوت کے قایل ہیں یا نہیں بلکہ یہ بھی کہ وہ ختم نبوت کے قایل نہیں ہیں تو انھیں کیا سمجھا جائے گا:۔ کافر، مشرک، ملحد، زندیق، فاسق یا کچھ اور (محض غیر مسلم کہہ دینا کافی نہیں کیونکہ یہ کوئی اصطلاحی لفظ نہیں) اور مناظرہ کی تمام روداد چند ایسے بیرونی علماء کے سامنے پیش کی جاتی جنھیں احمدی و غیر احمدی علماء دونوں کا اعتماد حاصل ہوتا اور انکی رائے کو قطعی فیصلہ قرار دیا جاتا۔ علاوہ لطف و تفریح کے مولویوں کو اس جھگڑے میں اُلجھا کر پاکستان کو دوسرے اہم مسایل پر توجہ کرنے کی فرصت مل جاتی اور دوسرے یہ کہ مذہبی مسایل کو خالص علمی طریقہ سے طے کرنے کی ایک مہذب و شایستہ رسم قایم ہو جاتی اور تیسرے یہ کہ پبلک کو ایک بار قطعی طور پر معلوم ہو جاتا کہ انکے علماء غلطی پر تھے ـ جس وقت لاہور میں ہنگامۂ قتل و غارتگری کی ابتدا ہوئی اور اسکی خبر مجھے پہونچی، تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ اس جھگڑے میں احمدی جماعت کو کیوں فریق مخالف سمجھا گیا۔ اختلاف تو در اصل حکومت سے تھا کہ اس نے احمدی جماعت کو اقلیت والی جماعت تسلیم نہیں کیا اور اس لئے حکومت ہی سے مقابلہ کرنا چاہئے تھا، غریب احمدی جماعت کا کیا قصور تھا کہ اسکے خلاف آستینیں چڑھائی گئیں ـ لیکن میں اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کچھ نہ سمجھ سکا ـــ آپ نے بہت ہلکی کر کے یہ خبر سنائی کہ "بزرگان دین" کئی سال کے لئے "بندی خانہ" پہونچا دئے گئے اور پاکستان اس موقع سے فایدہ اُٹھا کر "تمام بنیادی امور" کو بہ آسانی نپٹا سکے گا۔ لیکن مجھے اسکی امید نہیں کیونکہ چند علماء کو نظر بند کر دینے سے نہ انکی نسل منقطع ہو سکتی ہے اور نہ اس کا یقین ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا پھیلایا ہوا زہر اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے ـ ان کو تو جو بس بنا تھا بو چکے، مسلمانوں کی ذہنیت کو جتنا تباہ کرنا تھا کر چکے اور اگر آج چُن چُن کر ایک ایک مولوی کو ختم کر دیا جائے تو بھی ان کے پیدا کئے ہوئے مسموم اثرات دور کرنے اور انکی بگاڑی ہوئی ذہنیتوں کو سدھارنے کے لئے کم از کم ۲۵ سال کا زمانہ درکار ہے اور وہ بھی اس شرط کے ساتھ کہ پاکستان اپنے دستور میں کسی ایک جگہ بھی "کتاب و سنت" کا نام نہ لے اور ایسی جمہوریت قایم کرنا طے کرے جو مذہب کے تصور سے بالکل آزاد ہو ـــ مصری صحافیوں کا ایک وفد حال ہی میں پاکستان کی سیاحت کے لئے آیا تھا۔ اس کے ایک رکن محمد عبد القادر حمزہ (اڈیٹر البلاغ) پاکستان اور مسلمانانِ پاکستان کے متعلق جو خیالات و اثرات لیکر گئے ہیں وہ شاید آپ کی نگاہ سے گزرے ہوں گے ـ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

"پاکستان کا مولوی مذہبی شعبدہ باز ہے اور یہاں کا مسلمان بالکل اندھا اور جاہل انسان جسے اصول اسلام سے مطلق واقفیت نہیں، حال ہی میں جو فرقہ وارانہ ہنگامے احمدیوں کے خلاف ہوئے ہیں اور جن کے نتایج دیکھنے کا ہمیں خود موقع ملا ہے وہ اس بات کا بین ثبوت ہیں کہ ان کا اسلام ایک موروثی اندھے اعتقاد سے زیادہ کچھ نہیں اور وہاں کا مولوی اس سے بہت ناجایز فایدہ اُٹھاتا ہے۔"

اس بیان سے آپ کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ اینٹی احمدی ہنگاموں نے پاکستان کے وقار کو دنیا میں کتنا کم کر دیا ہے اور پاکستان کو اسکی تلافی کے لئے آیندہ کونسی راہ اختیار کرنا ہے۔ ابو الاعلیٰ مودودی کے ذکر میں آپ نے یہ بات بڑے مزے کی لکھی ہے کہ ان کی ناک میں نکیل نہ ہونے سے انھیں اب اونٹ کون تسلیم کرے گا۔ لیکن آپ کا ذہن شاید اس نکتہ کی طرف منتقل نہیں ہوا کہ اونٹ بہرحال اونٹ ہے اور اگر اس کی حیثیت "شترِ بے مہار" کی سی ہو تو اور زیادہ خطرہ کی چیز ہے ـــ رہا یہ امر کہ انھوں نے عوام کو صرف ایک بیان پر اُٹھا دیا اور محاذ چھوڑ کر پہلے ہی غایب ہو گئے۔ یہ بھی مولوی کی دنیا میں کوئی نئی بات نہیں ـ لاہور کے مجاہدِ اعظم (مولانا سعید نیازی) جو ہنگامۂ لاہور کے دوران میں مسجد وزیر خاں کے محراب و منبر سے واتشیوں کو حملہ کے احکام صادر کیا کرتے تھے، پنجاب کے ایک غیر معروف قریہ میں گرفتار کئے جاتے ہیں تو لوگوں کو ان کا پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ جس چہرہ پر پہلے ایک عریض و طویل داڑھی ہریالی رہتی تھی وہ اب عورتوں کے چہرہ کی طرح بالکل سادہ و صاف تھا ـــ اس کے علاوہ وہ واقعہ بھی آپ کے سامنے ہوگا جب پاکستان کے صدر جمعیۃ العلماء نے مشرقی بنگال کے طلبہ کے دھمکانے سے فوراً یہ معذرت لکھ کر دیدی کہ بنگلہ زبان کے متعلق جو کچھ انھوں نے اپنے خطبہ میں ظاہر کیا وہ صحیح نہ تھا۔

یہ لوگ بھی غضب کے ہیں، دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا، سحر آہن بنا لیا

مولانا شبلی کی شخصیت

اس دور میں مولانا شبلی کی شخصیت، اُن کی شاعری، اُن کی سیاست اور اُن کے خطوط کی طرف کافی توجہ کی گئی ہے۔ مگر نوجوان حلقے کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ چیز ان کے وہ خط ہیں جو انھوں نے بمبئی کی دو پڑھی لکھی متمول اور قدرے روشن خیال خواتین کے نام لکھے تھے۔ کچھ اسی قسم کے خطوط اگرچہ اقبال نے بھی لکھے تھے مگر اقبال کی شخصیت چونکہ ہمارے ذہن کو متاثر ہی نہیں بلکہ مرعوب بھی کرتی ہے اس لئے اُن کے یہاں اس قسم کے خطوط کا پایا جانا ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے۔ شبلی کی بات دوسری ہے کیونکہ وہ شاعر سے زیادہ مولوی ہیں۔ اُن کے یہاں جو جذبہ ہے وہ اپنی شدت کے باوجود ہمہ گیر نہیں اور قلم کی زبان تک آتے آتے اس پر نہ جانے کتنے پردے پڑ جاتے ہیں۔ ان پردوں کو اُٹھانے میں بہت سے لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے، یہاں تک کہ ان کی نیت پر بھی حملے کئے جاتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں جس چیز کی کمی ہے اُسے ہم آج اتنی دور سے، بڑی آسانی سے دیکھ لیتے ہیں، اور وہ کمی یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی باغیانہ تحریک نے جس طرح اور جس حد تک سرسید، حالی یا نذیر احمد کو متاثر کیا اُس طرح شبلی کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ غدر سے براہ راست متاثر ہو کے سرسید کی تحریک میں شامل نہیں ہوئے، صرف علی گڑھ کے اثر سے اس تحریک کے ساتھ ہو گئے۔ یعنی وہ اس آگ سے سرسید یا حالی یا غالب کی طرح نہیں گزرے۔ اس کی حرارت سے ان کے ذہن میں گرمی نہ آئی، روشنی البتہ ملی۔ جب غدر ہوا تو وہ پیدا ہوئے لیکن سرسید اس اثناء میں شعور کی انتہائی بلندی تک پہونچ چکے تھے۔ مولانا نے تو غدر کو تماشائی کی حیثیت سے بھی نہیں دیکھا تھا، پھر وہ حالی کی طرح غدر کے جلو میں خاندانوں کی تباہی، ذرائع معاش کی تنگی، زندگی کی دشواری، ذہن کی غارت گری، تخیل کی گمراہی کو کس طرح دیکھ سکتے؟ نذیر احمد ہی کو لیجئے۔ انھوں نے ایک مفلس، یتیم بچے کی طرح زندگی شروع کی مگر ان کا کمال یہ ہے کہ اس مفلسی کو جھوٹی شرافت میں چھپانے کے بجائے وہ اسے ظاہر کرنے، اس پر قابو پانے اور اس کو ایک سماجی قدر بنانے میں کامیاب ہیں۔ خاندانی وجاہت سے مرعوب ہونے کے بجائے نام نہاد شرفاء کی خانگی زندگی کی اُلجھنوں کو نمایاں کرنے میں بیباک ہیں عورتوں سے حُسنِ ظاہر سے متاثر ہونے کے بجائے ان کی جہالت، پھوہڑپن اور فطری کمینگی کے دور کرنے میں اُن کا قلم کوتاہی نہیں کرتا۔ شبلی کے یہاں ان میں سے کوئی بات نہیں۔ انھیں نہ شخص سے شغف ہے نہ سماج سے۔ صرف اپنے ذہن سے محبت ہے۔ صرف اپنی جولانیِ طبع کے اظہار سے دلچسپی ہے۔ صرف اس طوفان سے فایدہ اُٹھانے کی کوشش ہے۔ ان کے یہاں یقین ہے نہ عزم۔ صرف حوصلہ ہے۔ ہنگامی دلچسپیاں ہیں۔ جراَتِ رندانہ کی بھی کمی نہیں مگر وہ ادیب ہیں، رفارمر نہیں ہیں۔ سیاست داں ہیں، مفکر نہیں۔ وقت سے فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ شہرت کے پجاری ہیں۔ اور بسا اوقات سستی شہرت کے۔ آگ کو بھڑکتا ہوا دیکھ کر بجھاتے نہیں بلکہ اس پر اور تیل چھڑکتے ہیں۔ مولویوں کو جدید تعلیم کی طرف نہیں لاتے بلکہ انھیں ایک علحدہ کیمپ میں جمع کر دیتے ہیں۔ شبلی پر یہ سارے اعتراضات وزن رکھتے ہیں، خاص طور پر اس لئے بھی کہ ان کے عقیدت مندوں نے ان کی شخصیت پر جو ایک رنگین نقاب ڈالنے کی کوشش کی ہے وہ مضحکہ خیز ہے۔ چنانچہ نئی نسل جو ان رنگین نقابوں کی سب سے بڑی دشمن ہے ان اعتراضات کو بیشتر حق بجانب سمجھتی ہے۔ مگر

یہاں ایک بات پر غور کرنا ہے۔ شبلی نے جب سرسید کی مخالفت شروع کی تو کیا یہ کوئی ایسی بات تھی جو اوروں کے یہاں ہمیں نہیں ملتی؟ اُس دور کی تاریخ بتاتی ہے کہ سرسید کے مخالفوں کی تعداد ہزاروں تک پہونچتی تھی۔ ان میں سے جن بزرگوں کے نام ہم تک پہونچتے ہیں ان میں ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ مسٹر بھی ہیں اور مولانا بھی۔ ادنےٰ درجے کے لوگ بھی ہیں اور اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی، مگر عام طور پر یہ سب لوگ سرسید کے مذہبی خیالات سے بیزار ہیں۔ جن حضرات نے کالج کے لئے چندے دئے انھوں نے بھی سرسید کی تفسیر سے اختلاف ظاہر کیا۔ ان کی کس کس چیز کی مخالفت نہیں ہوئی —— تہذیب الاخلاق کی توڑ پر کیسے کیسے پرچے نہیں نکلے۔ مسدس حالیؔ کے جواب میں کیا کیا نظمیں نہیں لکھی گئیں، اُن کو نیچری، کافر، ملحد اور بے دین کے کیسے کیسے ناموں سے نہیں پکارا گیا۔ ان سب لوگوں کے مقابلہ میں مولانا شبلی کی حیثیت کس قدر معمولی تھی۔ ان کے چند مخالفانہ کلمے کس قدر حقیر تھے۔ جدید تعلیم پر ان کی تنقیدیں کس قدر جذباتیت سے معرّا، اصولی، اساسی اور حقیقی تھیں۔ ان تمام باتوں پر غور کیجئے تو اُن کی مخالفت کی اہمیت دب جاتی ہے اور یہ نظر آنے لگتا ہے کہ ان میں اور سرسید میں مخالفت تو کجا حد درجہ یگانگت ملتی ہے۔ مولانا کے معتقد خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہیں لیکن ان کے زمانہ میں لوگ انھیں سرسید کے گروہ کا ایک نامی پہلوان ہی سمجھتے تھے جیسا کہ شرر نے لکھا ہے۔ مثلاً ان پر جو الزام لگائے گئے اور سرسید پر جو فتوے صادر کئے گئے ان میں زیادہ فرق نہیں۔ اسی زمانہ میں مولانا ظفر الملک نے لکھا تھا: "ہمارے مولانا پرستارانِ عقلیت کی رایوں کے مطابق اسلام کی تاریخ گزشتہ اور قرآنی تعلیم کو ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں کہ خواہ مذہب کا منشا پورا نہ ہو لیکن متبعین یورپ کی تشفی ہوجائے۔ مولانا کی ایسی تمام تحریروں نے اگر ایک طرف حاملانِ شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر کیا تو دوسری طرف خود اسلام کی قوت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا دیا ہے۔" کیا ایسا ہی الزام سرسید پر بھی نہیں تھا اور کیا ان کی تحریروں نے بھی اسی طرح حاملانِ شریعت اور علمائے مذہب کو برافروختہ اور کبیدہ خاطر نہیں کیا تھا۔ اس کا جواب کھلا ہوا ہے، اور اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا نے سرسید سے جزوی اختلاف کے باوجود اُن سے بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ اس اختلاف میں بھی اختلاف کو اتنا دخل نہیں جتنا کدورت کو دخل ہے۔ اسی کدورت کو دل میں لیکر مولانا علی گڑھ سے نکلتے ہیں مگر علی گڑھ کا احسان اتنا بڑا ہے کہ اسے وہ بھلانا چاہیں بھی تو نہیں بھول سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سے جانے کے بعد بھی بہت سے ایسے مواقع آتے ہیں جب انھیں علی گڑھ کی کشش غالب نظر آتی ہے اور نواب محسن الملک تو آخر تک انھیں واپس آنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ مولانا بھی واپس آنا چاہتے ہیں مگر نہیں آتے، وعدے پر ٹالتے ہیں، حتیٰ کہ ندوہ انھیں اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

مولانا کی ابتدائی زندگی پر جو علی گڑھ سے پہلے ان کے وطن میں، تعلیم کے حصول یا تلاش معاش میں گزری تھی یہاں زور دینا ضروری نہیں اگرچہ اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اس میں ایک تو ان کی موروثی خصوصیات کی اہمیت ہے جس پر اکرام نے "شبلی نامہ" میں زور دیا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی ذات میں شروع میں انانیت یا خود پسندی کے عناصر ملتے ہیں، دوسرے زندگی کی طرف سے بے اطمینانی اور نفسیاتی تنہائی، بے چارگی اور کس مپرسی کا ایک احساس ملتا ہے جو عہدِ شباب کی لعنت بھی ہے اور برکت بھی مگر جس کی بنیاد ایک طرح کی روحانیت پر ہے۔ ان کے یہ اشعار دیکھئے جو اسی دور کے طفیل میں ہمیں ملتے ہیں

نبود بہ زمانہ یاورِ من ۔۔۔ نے خواہر و نے برادرِ من
از جورِ سپہر خستہ باشم ۔۔۔ در کنجِ غمے نشستہ باشم
کس را نبود بہ من نیازے ۔۔۔ من باشم و دردِ جانگدازے

اے پسر از چہ رمیدی از ما ؟ بازگو تا کہ چہ دیدی از ما ؟
گفتۂ ترکِ وفا یعنی چہ ؟ بافتی بزد و غا یعنی چہ ؟
تو بہ یک دم زدن اے مہ رخسار گشتۂ چوں من از من بیزار
وقت ہا بزم سخن ساختمی طرح بیت و غزل انداختمی ،
من بہ تو با دلِ ماتم زدۂ ، خستۂ ، سوختۂ ، غم زدۂ ،
بے حجابانہ ہم از سر ذوق ، عرض می داشتمی حالتِ شوق ،

ان اشعار میں ان کی داخلی کیفیت نمایاں ہے اور یہی کیفیت بعض فارسی خطوط میں بھی نظر آتی ہے مگر صرف انھیں چیزوں کی بنا پر ان کی سوانح عمری مرتب نہیں کی جاسکتی ۔ اکرام لکھتے ہیں :۔ لیکن اس بچّے کے لئے اپنے ماحول میں لفظ آرام و آسایش نہ تھی ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کو اس سے ایک طرح کی ضد تھی ۔ شبلی کو جن حالات سے سابقہ پڑا وہ تو غیر معمولی طور پر افسوس ناک اور مایوس کن تھے " حالانکہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ مولانا کو کسی قسم کی غیر معمولی دشواری کا مقابلہ کرنا پڑا ۔ ان کے یہاں جو خانگی معاملات ہیں وہ ایک اوسط درجے کے ہندوستانی خاندان کے عام واقعات ہیں مگر صرف انہی واقعات کی بنا پر کوئی مولانا شبلی بننا چاہے تو کامیابی معلوم ۔ اور پھر مولانا کو تو اپنے خاندان سے محبت بھی ہے جیسا کہ ان کے مرثیوں سے ظاہر ہوتا ہے مگر چونکہ وہ حساس طبیعت کے مالک ہیں اس لئے کہیں کہیں ان کی بعض تحریروں میں تلخی کی جھلک ملتی ہے ۔ مگر یہ تلخی صرف منہ کا مزا بدلنے کے لئے ہے ۔ اسے مولانا کی زندگی سے کوئی دائمی تعلق نہیں ۔ اس کا اثر وقتی ہے ۔ یہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ باپ اور بیٹے کے درمیان معمولی اختلافات کا ہونا موجبِ حیرت نہیں ۔ مولانا سے پہلے والی نسل میں اُن کی اپنی نسل کی بہ نسبت فرق ہونا چاہئے تھا ۔ گزشتہ نسل کی سب سے اہم خصوصیت اس کی روایت پرستی تھی ۔ اس روایت پرستی کی وجہ سے اُسے چند ایسی قدریں مل جاتی تھیں جن کی بدولت وہ ایک پُر امن زندگی گزار سکتی تھی ۔ یہ نسل سیاسی اور معاشرتی مسایل سے کوسوں دور رہتی تھی ۔ سماج میں جو مختلف فرقے تھے ان کی الگ الگ حیثیت کو تسلیم کرتی تھی ۔ اگرچہ کہیں کہیں بعض صوفی ، درویش یا شاعر ان فرقوں کو توڑ کر آفاقی وسعت اور انسانی برادری کا تصور بھی پیش کرتے تھے لیکن عام طور پر صوفیوں اور خانقاہوں کے اثر سے لوگ اپنی حالت پر قانع رہتے تھے ، تاہم مولانا کے اپنے زمانہ میں اس اندھی عقیدت کا پول کھلنے لگا تھا ۔ اپنی اور بزرگوں کی غلطیوں پر نگاہ پڑنے لگی تھی ۔ خود تنقیدی کا احساس بیدار ہوگیا تھا ۔ جاگیرداری کے قلعے پر پہلی ضرب لگ چکی تھی جو اگرچہ کاری نہ تھی مگر قلعہ کی دیوار میں رخنے پڑنے لگے تھے ۔ اسلام کی طاقت ہر جگہ روبہ زوال تھی اور فرنگی اسے اپنا غلام بنا رہا تھا ۔ اس طرح مولانا کا دور درحقیقت پرانے اور نئے کے درمیان معلّق ہے ۔ اس کا ایک قدم یہاں ہے دوسرا وہاں یہ دور ایک پل کی طرح ہے ۔ ایک ناگزیر کڑی کی مثال ہے ۔ اور مولانا کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس نئے دور کو سمجھنے کے لئے انھیں زیادہ دور نہیں جانا پڑا ۔ اس کے لئے جن نئی روایات کی ضرورت تھی اور جن نئی قدروں کا نفاذ عمل میں آیا تھا ان میں سے بعض قدریں ان کو اپنے ہی گھر میں مل گئیں ۔ ان کے والد کی وکالت بہت کامیاب تھی ۔ حکومت کے نزدیک ان کی بڑی عزت تھی ان کے چھوٹے بھائیوں میں سے ایک اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ولایت تک جا چکے تھے اور دوسرے نے وکالت شروع کر رکھی تھی چھوٹے بھائی کو پہونچانے کے لئے مولانا علی گڑھ گئے تو وہاں سر سید سے ملاقات ہوئی ۔ اس ملاقات نے گویا سونے پر سہاگے کا کام کیا ۔ حتیٰ کہ جب وہ مستقل قیام کی غرض سے دو بارہ وہاں پہونچے تو قدیم و جدید کے متعلق اُن کا ایک خاص تصور بن چکا تھا ۔ اس تصور میں یورپ کے اعتراف کے ساتھ ساتھ مشرق کی روایات کا احترام اور پھر ان پر اصرار بھی شامل تھا ۔ مولانا کا بنیادی خیال یہ ہے کہ مغرب جن نعمتوں سے آج مالا مال ہے وہ ہمیں آج سے بہت پہلے اسلامی سلطنت کے تصور میں

ملتی ہیں اس تصور کی لذت نے انھیں مغرب سے مرعوب نہ ہونے دیا اور جب کبھی انھوں نے اس تصور کو گلے سے لگایا تو ان کو ایک نیا کیف حاصل ہوا۔ "مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم" اور "الجزیہ" سے لیکر "الفاروق" اور "سیرت النبی" تک میں یہی کیف پایا جاتا ہے۔ ان کو پڑھ کر ایک نئی مغربی جمہوریت کا نقشہ آنکھوں کے آگے پھرنے لگتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ سرسید جیسا حقیقت پسند بھی جب ان تحریروں کو پڑھتا ہے تو ان کی تعریف کرتا ہے اور آج تک انھیں پسند کرنے والوں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ مولانا کی شخصیت میں جو دلکشی ہے اس کی وجہ اُن کی انانیت نہیں اور نہ یہ بات ہے کہ بقول اکرام کے وہ ہر جگہ حزب الاختلاف کے لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ اس کا راز اُن کی ہمہ جہت اور ہمہ گیر شخصیت، ان کے بلند ادبی مذاق، ان کی باعمل سرگرم ذہنی زندگی میں تلاش کرنا چاہئے۔ محض انانیت آپ کو تھوڑی دیر کے لئے اوپر اُٹھا سکتی ہے، مقبولیت عطا نہیں کرسکتی۔ مولانا کے یہاں انانیت نہیں انفرادیت ملتی ہے۔ ایسی ہی انفرادیت جیسی غالب کے یہاں بھی دکھائی پڑتی ہے۔ ان کی ہردلعزیزی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کے معتقدوں میں مہدی افادی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں اور مولانا محمد علی جیسے لوگ شامل ہیں، ان میں سے ہر ایک کی دوربینی، انصاف پسندی اور مجاہدانہ عزم و وقار کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ مولانا کے یہاں وہی ولولہ، وہی روح عمل، وہی صداقت شعاری اور وہی مجاہدانہ اسپرٹ پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے اپنے زمانہ میں انھیں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے مسلم لیگ پر تنقید کرکے، اُسے آزادی خودداری کا سبق پڑھاکر، قومی زندگی میں تاریخی شعور کے صحیح مقام کا احساس دلاکر، خلوص ایثار اور بے نفسی کا مظاہرہ کرکے اپنے عہد کی بڑھتی اور پھیلتی ہوئی زندگی کا ساتھ دیا۔ اُنھوں نے شعر العجم میں شعر کی تحلیل کی اور انیس کی شاعری سے دبیر کے کلام کا موازنہ کرکے صالح ادبی روایات کو مستحکم کیا۔ وہ اُردو زبان سے بڑی زندہ محبت رکھتے ہیں اور انجمن ترقی اُردو کے پہلے سکریٹری ہیں۔ اُنھوں نے اپنے دورِ نظامت میں اُردو کو بعض اچھی مفید اور معیاری کتابیں دیں۔ اپنی عمر کے آخری دور میں بھی انھوں نے ہماری زبان کو انتہائی سنجیدہ مصنفین کا ایک مخلص حلقہ دیا اور بیسویں صدی میں بھی استادی اور شاگردی کا ایک ایسا سلسلہ قایم کیا جو ہر لحاظ سے قابلِ تقلید ہے۔ چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی اور بہت سے ندوی حضرات مولانا کے شاگرد ہی نہیں بلکہ اُن کے پرستار بھی ہیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی اپنی قابلیت مسلّم ہے اس لحاظ سے مولانا کو معدودے چند خوش قسمت مصنفوں میں سے سمجھنا چاہئے۔ اسی دور کے دوسرے خوش قسمت شاعر داغ ہیں مگر مولانا کا ادبی حلقہ داغ کے حلقے سے یقیناً بڑا بھی ہے، بلند اور برگزیدہ بھی۔ ان کے حلقے میں چند ایسے عناصر ملتے ہیں جن کی وجہ سے مولانا کی شہرت لازوال ہے۔ موجودہ دور میں مولانا کی تصنیفات کی طرف سے جو بے اطمینانی ملتی ہے اس کی وجہ ان تصنیفات کی خامی نہیں بلکہ معیاروں کی تبدیلی ہے۔ اپنے زمانہ میں تو ان کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ لیجاتی تھیں۔ آج کل وہ بات نہیں رہی اور اس کا سبب یہ ہے کہ آج کل شاعر اور ادیب سے جو مطالبے کئے جارہے ہیں مولانا کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ لیکن صرف اسی بنا پر ان کی تمام کتابوں کو رد کردینا یقیناً ظلم ہے اگرچہ ایسا وہی لوگ کرسکتے ہیں جو ادب کی ارتقائی منزلوں سے ناواقف ہیں مگر حیرت ہے کہ عبدالحق جیسا نقاد بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اگر اکبر کی شاعری سے ہم آج بھی لطف حاصل کرسکتے ہیں، اگر اقبال کا پیام آج بھی ہمارے لئے خضر راہ ہے اگر مولانا حالی کی تحریریں آج بھی ہماری رہنمائی کرسکتی ہیں اور اگر ان سب کی مخصوص علامتیں اور وقتی تجربے آج بھی ہمارے لئے کوئی معنی رکھتے ہیں تو پھر مولانا شبلی نے ایسا کونسا قصور کیا ہے۔

مولانا کی شخصیت میں تنوع، تضاد اور رنگارنگی سب کچھ ہے لیکن اس کے ساتھ ایک وحدت بھی ہے۔ ایک مرکز بھی ہے

ایک رشتہ بھی ہے۔ وہ اپنے دور کے سب سے اچھے نمایندے ہوں یا نہ ہوں اپنی شخصیت کے بہترین ترجمان ہیں اور اس شخصیت میں چند ایسے اجزا ملتے ہیں جن کے باعث وہ دلکش ہوجاتی ہے، شخصیت میں یوں تو دلکشی کے بہت سے سامان ہوسکتے ہیں مگر سب سے زیادہ دلکش ایک انسان کی انسانیت ہوتی ہے۔ انسانیت صرف شرافت یا مروت یا خاکساری کا دوسرا نام نہیں۔ یہ باتیں تو فرشتوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ انسانیت محض نیکیوں کی پوٹ نہیں، ان سے آپ بزرگی حاصل کرسکتے ہیں، زندگی اور اسکی حلاوت آپ کو نصیب نہیں ہوسکتی۔ مولانا کو زندگی کی یہی حلاوت نصیب تھی۔ ان کی وہی باتیں جنھیں ہم بظاہر غیر اہم سمجھتے ہیں درحقیقت ان کی انسانیت کی گواہی دیتی ہیں۔ ورنہ آخر انھیں ڈاکٹر انصاری کے بوٹوں پر سر رکھنے کی اس وقت کیا ضرورت تھی جب وہ ٹرکی ایک طبی وفد لیکر جارہے تھے۔ مولویوں کی بدگمانی کے باوجود ابوالکلام آزاد سے ان کے تعلقات دفعتًا اتنے گہرے کیوں ہوگئے۔ بمبئی کی تعریف میں ان کی رطب اللسانی یک بیک کیوں اتنی بڑھ گئی۔

شاعری از من مجو دور از سواد بمبئی — حالیا شبلی شدم رندِ غزل خواں نیستم
شبلیا آں جلوۂ شیر نگہائے بمبئی — بود تا وقتے کہ من خوابِ گرانے داشتم
دامنِ عیش زدستم نہ رود تا شبلی — دامنِ بمبئی از کف ندہم تا باشم
نثار بمبئی کن ہر متاعِ کہنہ و نو را — طراز مسند جمشید و فرِ تاج خسرو را

پھر کیا تعجب ہے کہ ان خیالوں میں اکثر اوقات اتنا تضاد نظر آتا ہے کہ مثلاً ایک طرف وہ مسجد کان پور پر باغیانہ نظمیں لکھتے ہیں اور دوسری طرف عبدالماجد (دریا آبادی) سے جو معذرت نامہ حکومت کے یہاں لکھواتے ہیں اُس میں اپنی وفاداری کا ہر طرح سے یقین دلاتے ہیں۔ ایک جگہ ترکوں اور عربوں سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں اور دوسری جگہ سرسید کے کہنے پر خلافت کے خلاف مضمون لکھ مارتے ہیں، گو بعد میں "آورد" کہکر اس سے پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ اپنی کتابوں میں جمہوریت اور حریت کا درس دیتے ہیں لیکن مسلمان بادشاہوں اور امیروں کی شان میں قصیدے بھی لکھتے ہیں، مثلاً سلطان عبدالحمید کی تعریف میں، ان میں جمہوریت اور انصاف کا خون انھوں نے جایز رکھا ہے، غرض وہ ہر نئی تحریک کے ساتھ ہیں مگر تحریک کی خاطر نہیں بلکہ جن سے محبت رکھتے ہیں اُن کی خاطر۔ اکثر ان کی محبت بے لوث ہوتی ہے۔ وہ اس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کر سکتے ہیں، حتی کہ اپنی عزت اور شہرت کو بھی قربان کرسکتے ہیں۔ یوں تو انھیں اپنے دوستوں اور شاگردوں میں سب سے اُلفت ہے مگر ابوالکلام اور خصوصًا عطیہ بیگم سے ان کی انسیت، شوق کے درجے میں آجاتی ہے۔ گو یہ درست ہے کہ عطیہ بیگم کو ان کے ساتھ عمر، ذہن یا مرتبے کے اعتبار سے کوئی مناسبت نہیں لیکن محبت کو کسی آلے یا پیمانے سے ناپنا کب درست ہوسکتا ہے۔ مولانا کے ان خطوں کو جو عطیہ بیگم کے نام ہیں لبرل[1] تنقید ہمدردی کا مستحق سمجھتی ہے۔ انفرادیت پسند[2] تنقید تنگی اور ہجو کی خواہشات کا اظہار گردانتی ہے۔ قدامت پسند[3] تنقید گناہگاری کا تمغہ عطا کرتی ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں گناہ اور جنس کا شائبہ تک نہیں۔ صرف دوستی، سادگی، عقیدت اور احترام کے جذبات ملتے ہیں۔ ان میں ایک ذہین مرد، ایک ذہین عورت کو مخاطب کرتا ہے۔ اس سے ملکی قومی اور ادبی معاملات پر گفتگو کرتا ہے۔ اُسے اپنے ذہن کا ایک گوشہ دکھاتا ہے جو اس نے کسی اور کو نہیں دکھایا تھا۔ یہ عورت چونکہ اس کے اپنے ماحول سے بلند اور ذرا علحدہ ہے لہذا وہ اس کی دوستی پر قدرے فخر محسوس کرتا ہے۔ اسکی لکھی ہوئی باتوں کو دوسروں کو سناتا ہے۔ اس کے سامنے جب آتا ہے تو اپنی صدیوں کی روایات کو فراموش کر بیٹھتا ہے اور ایک

---

[1] شیخ محمد اکرام - شبلی نامہ — [2] وحید قریشی - شبلی کی حیات معاشقہ — [3] مولوی محمد امین زبیری - تبصرۂ حیات شبلی یا مولانا شبلی کی زندگی کا رنگین پہلو۔

نئی اور عجیب سی فضا میں کھو سا جاتا ہے - شریعت کے احکام اُسے یاد نہیں رہتے، صرف اپنے ضمیر کی آواز اُس کو سنائی دیتی ہے۔ یہاں وہ مرد کی حیثیت سے نہیں انسان کی حیثیت سے آتا ہے، چنانچہ ان خطوں میں سب سے اہم مولانا کی انسانیت اور معصومیت ہے - دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان میں انسانی محبت کو جسم کے بجائے ذہن کی روشنی میں دیکھنے کی جو کوشش ہے وہ کم از کم اُردو ادب میں بڑی خوشگوار ہے - الغرض یہ خطا ہے نہ ثواب، جنس ہے نہ افلاطونیت بلکہ سیدھا سادا اعتراف اور دوستی کا وہ درجہ ہو جہاں ایک ذہن دوسرے کے اثرات قبول کرتا ہے - ایک شخص دوسرے کو اپنے دل کے کچھ بھید بتاتا ہے - اس سے زیادہ جو لوگ ان خطوں کی اہمیت کے قایل ہیں وہ خود جنس پرستی کے شکار ہیں - ہمیں انہی کے ساتھ ہمدردی ہے، مولانا کے ساتھ نہیں -

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے - مولانا کے تعلقات اپنے معاصرین کے ساتھ کیسے تھے - اس سلسلہ میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں سطحیت اور ذہنی غلاظت عام طور پر ملتی ہے - مولانا کے تعلقات سرسید کے ساتھ جس قسم کے تھے اس پر اوپر لکھا جا چکا ہے، ان کے دوسرے ہم عصر بزرگ مولانا حالی ہیں - یہ عمر میں بھی ان سے بڑے ہیں اور ساتھ ہی تصنیف و تالیف میں بھی ان کا سن و سال زیادہ ہے - مہدی کے الفاظ میں وہ بوڑھے حالی ہیں، ان کی نظر بعض اوقات سرسید سے بھی زیادہ تیز اور زیادہ گہری پڑتی ہے - انھیں زندگی کا پختہ شعور اور ادب میں ایک غیر معمولی بصیرت حاصل ہے - انھوں نے اپنی سوانح عمریوں سے شبلی کو سوانح نگاری کا، اپنے "مقدمہ" سے تنقید نگاری کا اور اپنی شاعری سے جدید شاعری کا راستہ دکھایا - شبلی اور حالی کے تعلقات پر مولانا سید سلیمان ندوی نے "حیاتِ شبلی" میں اور پروفیسر آلِ احمد سرور نے اپنے ایک مضمون میں کافی روشنی ڈالی ہے اور اُس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے جو مہدی افادی کے معاصرانہ چشمک والے مضمون سے پیدا ہوگئی تھی - آلِ احمد سرور کے بقول یہ چشمک حالی اور شبلی میں نہیں اُن کے جانشینوں میں پائی جاتی ہے - در اصل یہ ان کے جانشینوں میں بھی نہیں صرف بعض حضرات کے دماغوں میں ملتی ہے، ان سے باہر اس چشمک کا کوئی وجود نہیں - شبلی اپنے کو دریا اور حالی کو کنواں کہتے تھے اور ان کی کتابوں میں حیاتِ سعدی اور یادگارِ غالب کو بے حد پسند کرتے تھے - جب شبلی کو حادثہ پیش آیا تو حالی نے ان کے لئے نہایت محبت بھرا خط لکھا (یہ خط دار المصنفین کے کتب خانہ میں محفوظ ہے) اسی طرح شبلی نے اپنی تحریروں، تقریروں میں حالی کے حوالے دیکر اُن کی تعریف کی - البتہ حیاتِ جاوید کے بارے میں ان کی رائے کچھ اچھی نہ تھی لیکن اس کی وجہ خود حالی سے اختلاف نہیں بلکہ انکے یک طرفہ بامروّت شریفانہ طرزِ سوانح نگاری سے اختلاف ہے - مولانا کا خیال یہ ہے کہ سوانح نگاری میں شرافت یا مروّت سے کام نہیں چلتا اور غور سے دیکھا جائے تو یہ خیال غلط نہیں -

شبلی نے مولوی محمد حسین آزاد کی کتاب سخندانِ پارس کے بارے میں ایک خط لکھتے ہوئے ان کے طرزِ ادا اور ان کے سحر نگار قلم کے اعجاز کو تسلیم کیا ہے - پھر آزاد کی موت پر ان کا یہ جملہ "حیاتِ شبلی" میں ملتا ہے - "آج خدائے سخن مرگیا" اس مختصر جملے سے ان کی دلی کیفیات کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے - مولانا کے دیگر معاصرین میں محسن الملک، وقار الملک، سید علی بلگرامی، مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی، مہدی حسن افادی الاقتصادی، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی، شرر، داغ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں - غرض مولانا کا دائرۂ احباب خاصا وسیع ہے اور وہ اپنی معلومات کو بڑی وسعت کے ساتھ اپنے دوستوں اور شاگردوں میں تقسیم کرتے ہیں جیسا کہ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے - ایسے خطوط کا سلسلہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی سے لیکر عبدالماجد دریا بادی اور مولانا حمید الدین فراہی وغیرہ تک پھیلا ہوا ہے - گویا ایک دریا ہے کہ جہاں سے گزرتا ہے زمین کو سیراب کرتا جاتا ہے - اقبال کے متعلق مولانا کی یہ پیشین گوئی اہم ہے کہ وہ ایک دن اُردو شاعری کی خالی ہونے والی کرسیوں میں سے ایک کا حقدار ہوگا حسرت کو انھوں نے انسان کے بجائے جن کا خطاب دیا تھا - پریم چند کے بارے میں اُن کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں کوئی شخص پریم چند سے بہتر زبان نہیں لکھتا - حبیب الرحمن خاں شروانی کی علمیت پر مولانا کو اس قدر ناز تھا کہ

وہ ان سے اپنی تصنیفات کے سلسلہ میں بے تکلف مشورے کیا کرتے تھے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اس وجہ سے ضروری تھی کہ مولانا کو ایک خاص حلقے میں اکل کھرے پن اور تنک مزاجی کا جو الزام دیا گیا ہے وہ ہرگز درست نہیں۔ شبلی کی دوستی ایک زمانہ میں جب وہ حیدر آباد میں تھے اس وقت شرر اور داغ سے بھی تھی۔ ان تینوں بزرگوں اور مولوی عزیز مرزا وغیرہ کی بے تکلف صحبتوں اور مشاعروں کا حال خود مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف "چند ہم عصر" میں لکھا ہے۔ جب شرر کو حیدر آباد سے نکلنا پڑا تو مولانا نے مولوی محمد امین زبیری کے نام جو اس وقت بھوپال میں صیغۂ تاریخ کے مہتمم تھے ایک خط لکھتے ہوئے شرر کی اس طرح سفارش کی۔ "آپ کو معلوم ہے کہ مولوی عزیز مرزا صاحب بی۔ اے حیدر آباد سے نکلے تو ان کے مقربین بھی زد میں آئے۔ ان میں مولوی عبدالحلیم شرر بھی ہیں۔ یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ مولوی صاحب موصوف عربی اُردو کے کیسے ماہر اور ساتھ ہی انگریزی داں بھی ہیں ان کی قابلیت کے آدمی کم ہاتھ آسکتے ہیں۔ اگر وہ محکمۂ تعلیمات میں لے لئے جائیں تو بہت مفید ہوگا۔" مختصر یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت کسی طرح بند ہے نہ محدود بلکہ بڑی کھُلی ہوئی، بڑی رنگین، جاذب نظر، جلد بکھر جانے والی، پگھل جانے والی شخصیت ہے۔ غالب کی طرح اُن کے ارمان بہت نکلے لیکن پھر بھی کم نکلے۔ اُنھوں نے سرسید کی طرح علماء کو ناراض نہیں کرنا چاہا مگر اس حکمت عملی کا نتیجہ خاطر خواہ نہ ہوا اور علماء آخر کار اُن سے ناراض ہوگئے۔ وہ علماء کے اس فتنہ و فساد سے واقف تھے لیکن خواہ مخواہ ان سے ڈرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ یہی ان کی جرأت، نیک نیتی اور مستقل مزاجی کا ثبوت ہے جس کے سبب ان کا نام زندہ رہے گا۔ اُن کی خودداری، اُن کی سادگی، ان کا علمی ذوق، ان کی جدت طرازیاں اور ان کے کارنامے ہماری ادبی اور قومی محفلوں کو گرماتے رہیں گے، ان کا چست، دلفریب اور بیباک طرز نگارش، ان کی گہری تنقیدی نظر، اور اُن کی گرم گرم جوش بیان سے لبریز فارسی غزلیں اور اُردو سیاسی نظمیں ہمارے ادب کے ایوان میں ہمیشہ جگمگاتی رہیں گی۔

مفتون احمد

آپ کی زبان کی نوک بھی قوت تخلیق کا ایک بڑا راز ہے جسے اب تک سائنس داں پوری طرح معلوم نہیں کرسکے۔ ماہرین نفسیات اب تک نہیں سمجھ سکے کہ چیزوں کے مختلف مزے کیوں محسوس ہوتے ہیں۔ شکر کیوں میٹھی معلوم ہوتی ہے اور ایلوا کیوں کڑوا محسوس ہوتا ہے۔ ابھی نہیں لیکن جب قوت ذائقہ کی کمسٹری پوری طرح دریافت ہوجائیگی تو اس کی حقیقت کا پتہ چل سکے گا۔

زبان کی نوک جو ایک انچ کے تیسرے حصہ کے برابر ہے اپنے اندر ذائقہ کے دس ہزار بلب یا قمقمے پنہاں رکھتی ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر بلب ایک خاص احساس کو دماغ تک پہونچاتا ہے۔ اس سے قبل خیال کیا جاتا تھا کہ ہر شخص کی قوتِ ذائقہ ایک سی ہوتی ہے، لیکن اب معلوم ہوا کہ بعض لوگوں کی قوتِ ذائقہ بھی بینائی کی طرح کم زیادہ ہوتی ہے۔ ایک نئی کیمیائی چیز جسے Thiourea کہتے ہیں، دس آدمیوں میں سے صرف چھ کو تلخ معلوم ہوتی ہے اور باقی چار کو پھیکی۔ ڈاکٹر جان ہکسلے اور دوسرے ماہرین سائنس نے ۲۷ چمپنزی بندروں پر اس کا تجربہ کیا تو بھی نتیجہ یہی برآمد ہوا۔

بچے بجائے زبان کے اپنے گالوں سے مزہ محسوس کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے ذائقہ کے بلب گال میں پائے جاتے ہیں، جو عمر کے ساتھ ساتھ فنا ہوجاتے ہیں یا زبان کی نوک میں منتقل ہوجاتے ہیں۔

داغ اور بہار

(۱)

ادیب اور اس کے محرکات کی دنیا بہت وسیع ہوتی ہے وہ کسی قوم، ملک اور صوبہ کی جاگیر نہیں۔ داغ دہلی میں پیدا ہوئے لال قلعہ میں پرورش پائی، دہلی، رامپور اور حیدر آباد کے درباروں کی سرپرستی میں پروان چڑھے، لیکن داغ کی شاعری دہلی، رامپور اور حیدر آباد کے مثلث میں محدود نہیں۔ شاعری کے اندر ماحول کا پرتو ناگزیر ہے۔ آسمان شاعری کے اندر مقامی رنگ کی حیثیت قوس قزح کی ہے۔ لیکن ان سب کے پیچھے شعور و لاشعور کی تہوں میں جو چیز اندر اندر کام کرتی ہے وہ شاعر کے اپنے محرکات شعری ہیں۔ داغ نے شاعری اس وقت شروع کی جب وہ نوجوان تھے۔ ان کی شاعری کے اندر ان کی نوجوانی تادمِ آخر باقی رہی۔ داغ کی شخصیت اور ان کی انفرادیت اسی نوجوانی میں چھپی ہے۔ جوانی اور اس کی اکڑ کو اگر داغ کی شاعری سے نکال دیا جائے تو انکی شاعری ایک بجھا ہوا چراغ معلوم ہوگی۔

داغ کی پرورش لال قلعہ میں ہوئی، لال قلعہ کی رنگینی داغ کی رگوں میں پیوست تھی۔ وہ ۲۶ سال کی عمر تک لال قلعہ میں رہے۔ ۱۸۵۷ء میں سلطنت مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ کو انگریزوں نے گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا تو لال قلعہ کی رنگینی صحبتیں درہم برہم ہوگئیں۔ دہلی کی اس تباہی پر داغ نے ۲۳ بندوں کا ایک شہر آشوب لکھا ہے صرف ایک بند ملاحظہ ہو:۔

یہ وہ جگہ ہے کہ عبرت پہ عبرت آتی ہے　　یہ وہ جگہ ہے کہ حسرت پہ حسرت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ آفت پہ آفت آتی ہے　　یہ وہ جگہ ہے کہ شامت پہ شامت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے جہاں بیکسی بھی ڈر ڈر جائے
یہ وہ جگہ ہے اجل خوف کھائے مر مر جائے

ایک مغل شہزادہ مرزا قادر بخش صابر تلمیذ مولوی امام بخش صہبائی نے شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ "گلستانِ سخن" اُردو زبان میں لکھا ہے۔ یہ تذکرہ ۱۲۷۱ھ میں شایع ہوا اس کا ذکر گارسان دتاسی نے اپنے خطبوں میں کیا ہے اس تذکرہ میں داغ کے ۱۹ اشعار بطور نمونہ درج ہیں۔ ان اشعار میں داغ کی جوانی اور اس کی اکڑ صاف نمایاں ہے:۔

نہیں تاب ستم تو حضرتِ دل　　عاشقی کو سلام کرنا تھا
ہم جانتے ہیں خوب تری طرز نگہ کو،　　ہے قہر کی آنکھ اور محبت کی نظر اور
کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری　　لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

غدر کے بعد جب لال قلعہ کی رنگینیاں ختم ہوگئیں اور بادشاہ سلامت رنگون بھیج دئے گئے تو مرزا داغ بہت پریشان ہوئے۔ اس پریشانی میں دلی کی بربادی پر ایک شہر آشوب لکھا اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ دلی اور لال قلعہ کی تباہی داغ کی تباہی تھی لیکن اس بربادی میں داغ کی اکڑ نہ گئی۔ ملاحظہ ہو:۔

اے داغ اہلِ شہر کا لٹنا تو درکنار　　تنخواہ بھی خزانۂ شاہی میں رہ گئی

غزل کے اندر داغ کی شوخی اور اکڑ ملاحظہ ہو:۔

پڑا فلک کو کبھی دل جلوں سے کام نہیں ۔۔۔ اگر نہ آگ لگا دوں تو داغؔ نام نہیں
دباؤ کیا ہے سنے وہ جو آپ کی باتیں، ۔۔۔ رئیس زادہ ہے داغؔ آپ کا غلام نہیں
اے داغؔ اپنی وضع ہمیشہ یہی رہی ۔۔۔ کوئی کھچا کھچے کوئی ہم سے ملا ملے
تم کہتے ہو معشوق اطاعت نہیں کرتے ۔۔۔ عاشق بھی تو معشوق کا نوکر نہیں ہوتا

دلی کی تباہی اور بربادی کے بعد مرزا داغؔ نواب یوسف علی خاں ناظم رامپور کے دربار میں حاضر ہوئے۔ نواب کو شعر و شاعری کا شوق تھا۔ شعرائے لکھنؤ اسیرؔ، امیرؔ، تسلیمؔ اور جلالؔ وغیرہ ان کے دربار سے وابستہ تھے۔ نواب نے مرزا داغؔ کا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا اور نواب کلب علی خاں ولی عہد رامپور کا مصاحب مقرر کیا۔ کچھ عرصہ بعد نواب کلب علی خاں والیِ رام پور ہوئے، اس دور میں مرزا داغؔ کی خوب قدر دانی ہوئی۔ یہ دور رام پور کا رنگین دور تھا اس دور کی زندگی مجسم شباب تھی۔ رام پور کی رنگینیوں میں مرزا داغؔ کی جوانی خوب پروان چڑھی۔ رام پور میں بے نظیر باغ کا میلہ لگا کرتا تھا اس میلہ میں کلکتہ کی ایک طوائف ماہ منیرؔ سے آنکھ لڑ گئی داغؔ اس پر جی جان سے فدا ہو گئے، ماہ منیر عرف منی جان شاعرہ تھی اس کا تخلص حجابؔ تھا۔ میلہ کے بعد ماہ منیرؔ کلکتہ واپس ہو گئی پھر اس نے وہاں سے داغؔ کو ایک خط لکھا اور کلکتہ آنے کی دعوت دی۔ داغؔ نے اپنی مثنوی "فریادِ داغؔ" میں اس خط کا یوں ذکر کیا ہے :۔

ہم یہاں تم وہاں تو لطف نہیں، ۔۔۔ ہے یہ دوری جہاں تو لطف نہیں
اُٹھ کے سیدھے ادھر چلے آؤ، ۔۔۔ کوئی روکے مگر چلے آؤ،
میہماں تم ہو میزباں ہم ہوں، ۔۔۔ عیش و عشرت کے لطف باہم ہوں

محبوب کی دعوت قبول کیوں نہ ہو۔ جواب لکھ دیا کہ میں فوراً آ رہا ہوں۔ جواب ملاحظہ ہو ؎

تم بلاؤ نہ آؤں کیا ممکن ۔۔۔ ہے سراسر یہ بات ناممکن

اب داغؔ کلکتہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ پہلے دہلی آئے، پھر لکھنؤ پہونچے، کانپور الہ آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد آئے۔ میر محمد باقر باقرؔ عظیم آبادی تلمیذ حضرت وحید الہ آبادی کے گھر قیام کیا۔ عظیم آباد میں اپنے قیام کا مفصل تذکرہ خود داغؔ نے اپنی مثنوی میں نظم کیا ہے۔ مثنوی کے مطابق داغؔ نے عظیم آباد میں آٹھ دن قیام کیا ؎

آٹھ دن دیکھی سیر پٹنے کی ۔۔۔ یہ ہوئی وجہ جی اُچٹنے کی

اس شعر سے قیام کی مدت تو معلوم ہوئی لیکن مثنوی کے کسی شعر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ داغؔ کا یہ سفر کس سن میں ہوا۔ داغؔ کے سوانح نگاروں نے بھی اس مسئلہ پر روشنی نہیں ڈالی، احسن مارہروی نے "انشائے داغ" میں داغؔ کا ایک خط بنام کلب علی خاں خلد آشیاں شایع کیا ہے :۔

غریب پرور فیض گستر سلامت

جناب عالی! فدوی بہ ضرورت چند درچند از ہفتہ دارد عظیم آباد پٹنہ گشت و از آں جا قصد کلکتہ نیز دارد۔ لہٰذا امید دارم کہ از راہ غریب نوازی رخصت دو ماہ دیگر مرحمت شود۔ واجب بود عرض نمود

الٰہی آفتاب دولت و اقبال تاباں باد

عرضی فدوی نواب مرزا خاں داغؔ۔ مورخہ یکم جون ۱۸۸۲ء از عظیم آباد پٹنہ، محلہ گرہٹا مکان سید باقر۔

حضرت داغؔ میر محمد باقر باقرؔ عظیم آبادی کے مہمان تھے۔ داغؔ کے علاتی بھائی مرزا شاہ محمد شاغلؔ خلف مولوی تراب علی متوطن دہلی میر باقرؔ کے دوست اور ان کے پڑوسی تھے۔ میرزا شاغلؔ داغؔ کے شاگرد بھی تھے۔ وہ عرصہ تک عظیم آباد میں رہے۔ شطرنج بازی میں یگانہ روزگار تھے۔ داغؔ جس وقت ریل سے اُترے عظیم آباد کی خلقت استقبال کے لئے حاضر تھی۔ اس بھیڑ میں مرزا شاغلؔ بھی تھے ؎

پیشوائی کے واسطے احباب　　آئے تھے شوقِ دید میں بیتاب
بہت اشخاص یک بیک آئے　　اپنی اپنی سواریاں لائے
کوئی مجھ کو لئے ہی جاتا تھا　　کوئی ناحق کا حق جتاتا تھا
کوئی کہتا کہ میرے گھر چلئے　　آئیے اس طرف اِدھر چلئے
ہوئی لوگوں کی چپقلش کیا کیا　　رہی آپس میں کشمکش کیا کیا
مجھ کو یہ فکر تھی کہ بھیڑ چھٹے　　میرزا شاغل آئے جب وہ ہٹے
یہ وہ ہیں نام خلق ہو جن سے　　آدمیت مراد ہے ان سے

میر باقر چونکہ مرزا شاغل کے گہرے دوست اور پڑوسی تھے، اس لئے داغ نے میر باقر کے گھر قیام کیا۔ میر باقر کے متعلق احسن مارہروی کا نوٹ ملاحظہ ہو:۔

"سید محمد باقر متخلص بہ باقر شاگرد وحید الٰہ آبادی پٹنے کے شرفا میں تھے۔ موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے، ستار کا بہت شوق تھا۔ اچھے خوشنویس تھے اور اس فن سے آگاہ تھے اسی ہم مذاقی نے مرزا داغ کو ان کا مہمان بنایا۔"

میر باقر نے ۱۱ر فروری ۱۹۲۷ء کو انتقال کیا۔ آپ کا پختہ مزار محلہ گورہٹہ میں اپنے مکان کے قریب واقع ہے آپ کا منتخب اردو دیوان "سرمایۂ عشق" ۱۹۲۶ء میں شایع ہوا، آپ کی ایک اردو مثنوی "کیمیائے دل" ۱۹۱۱ء میں شایع ہوئی۔ آپ کے بھانجہ اور آپ کے شاگرد میر سید حسن صاحب سید بقید حیات ہیں۔ سید حسن رضا صاحب ثاقب، عظیم آبادی بھی آپ کے شاگرد رشید ہیں۔ حضرت شاہ حامد حسین صاحب حامد سجادہ نشین تکیہ حضرت شاہ ارزاں تلمیذ حضرت داغ کے آستانہ پر شاندار مشاعرے ہوا کرتے تھے احسن مارہروی، سائل دہلوی، نوح ناروی، فصاحت لکھنوی، جلیل مانکپوری، ریاض خیرآبادی، کوثر خیرآبادی وغیرہ شریک مشاعرہ رہتے۔ سائل دہلوی جب پہلی بار پٹنہ آئے تو میر باقر صاحب سے ملنے گئے، وہ برابر میر باقر صاحب کو چچا کہا کرتے تھے۔ سائل دہلوی جب دہلی واپس ہوئے تو اپنی بیگم کو میر باقر اور داغ کے تعلقات کی داستان سنائی۔ بیگم سائل نے میر باقر کو خط لکھا اور دہلی آنے کی دعوت دی لیکن میر باقر پیرانہ سالی کی وجہ سے دہلی نہ جاسکے۔

"انشائے داغ" میں داغ کا ایک دوسرا خط مورخہ ۷ر مئی ۱۸۸۲ء بنام نواب سید بہادر حسین خاں انجم نیشاپوری لکھنوی بھی شامل ہے۔

جناب خاں صاحب عنایت وکرم فرما، مجمع محاسنِ فراواں، مصدرِ منت واحساں بہادر حسین خاں صاحب دام عنایۃ، بعد سلام مسنون واضح ہو کہ میں بخیروعافیت وارد پٹنہ عظیم آباد ہوا۔ محلہ گرہٹا مکان سید باقر صاحب میں مقیم ہوں۔ چار روز ہوئے کہ وہ کلکتہ روانہ ہوگئے۔ سید قطب الدین کو اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ یہاں کی آب وہوا نہایت خراب، گرمی کی نہایت شدت اہلِ عظیم آباد نے میری اس قدر خاطر وعزت کی ہے کہ جس کی حد نہیں۔ کلکتہ نہیں جانے دیتے میری طبیعت علیل ہوئی جاتی ہے۔ اب بھی علیل ہے، سرکار میں خط بھیجا ہے۔ ان کے جواب کا منتظر ہوں۔ منشی تیج بہادر نے جو اپنے اخبار میں دیوان کے آنے کی کیفیت لکھی ہے اس کی نقل جلد بھجوا دو۔ چھپنے کی جلد کیفیت لکھو۔ اپنی خیریت سے آپ جلد آگاہ کریں۔ سب دوستوں کو سلام پہونچے۔

راقم نواب مرزا داغ دہلوی - ۷ر مئی ۱۸۸۲ء

پہلا خط جو نواب کلب علی خاں کے نام ہے ۱ر جون ۱۸۸۲ء کو لکھا گیا۔ دوسرا خط جو ۷ر مئی ۱۸۸۲ء کو تحریر پایا، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ داغ ۳ر مئی کو عظیم آباد آئے۔ ان خطوط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ داغ عظیم آباد میں ایک ماہ سے زیادہ مقیم رہے۔

۲ر مئی ۱۸۸۲ء کو عظیم آباد آئے، ۱ر جون ۱۸۸۲ء کو نواب کلبِ علی خاں کے نام خط لکھا - اور ۲ ماہ کی فرصت طلب کی جو یقینی منظور ہوئی ہوگی -

داغ جب تک پٹنہ میں مقیم رہے ایک ہلچل مچی رہی - ہر روز مشاعرے اور محفلوں کی گرما گرمی رہتی - میر باقر کے گھر ہر وقت ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، شام کے وقت داغ خود بھی مرزا شاغل کے ساتھ باز دید کے لئے جایا کرتے تھے - داغ کو صوفیائے کرام سے بڑی عقیدت تھی - اسی عقیدت کی تحت وہ پیر طریقت شاہ محمد یحیٰ صاحب ابوالعلائی سجادہ نشین خانقاہ شاہ کی املی شہر پٹنہ سے بھی ملے - حضرت شاہ صاحب کو شعر و شاعری سے شوق تھا، داغ سے ملکر بہت مسرور ہوئے - ملاقات کے دوسرے دن تین قطعے لکھکر بھجوادئے حضرت شاہ صاحب کا نوشتہ قلمی نسخہ محترمی مولوی فصیح الدین بلخی صاحب ریڈر شعبہ تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کے پاس اب تک محفوظ ہے - ان قطعوں کو اصل نسخہ سے نقل کر رہا ہوں ؎

قطعہ تاریخ قدوم نواب صاحب متخلص بہ داغ از رامپور بہ عظیم آباد :-

جناب داغ در شہر من آمد، — رسیدند آرزو منداں زہر سوئے
بلوح دہر تاریخ قدومش — رقم کردم قدوم داغ حق گوئے

۱۲۹۹ھ

ایضاً

جناب داغ عالیجاہ آمد در عظیم آباد — مثال گل بہار افزائے دل چوں ماہ نور افشاں
ہمیں مصراع تاریخ از دروں من بروں آمد — رسیدہ مرہم دلہائے رنجوراں انیس جاں

۱۲۹۹ھ

ایضاً

یکتائے زمانہ داغ خوشگو، — در ملک سخنوری بود شاہ
در وصف کمال آں ہنرور — داماں دراز نظم کوتاہ
امروز بہ ارضِ ہند مثلش — بنود یک فرد یعلم اللہ
در پٹنہ برائے سیر آمد — نور افشاں نور پاش چوں ماہ
شد طبع نیاز مند مسرور — از دیدن آں یگانہ دلخواہ
تاریخ قدوم اگر بپرسند — گو مقدم داغ صاحب جاہ

۱۲۹۹ھ

اس وقت عظیم آباد کے اندر داغ کے معاصرین کے نام یہ ہیں :- " خواجہ فخرالدین سخن دہلوی تلمیذ حضرت غالب، صفیر بلگرامی (سن وفات ۱۸۹۰ء) میر نجف علی نذر تلمیذ الفت حسین فریاد، حکیم مولانا عبدالحمید پریشاں (وفات ۱۹۰۵ء) شمس العلماء مولانا حاجی شاہ محمد سعید حسرت عظیم آبادی (وفات ۱۳۰۴ھ) کنور سکھراج بہادر رحمتی، مہدی حسن خاں شاداب تلمیذ حضرت امیر مینائی (۱۳۰۵ء) میر محمد باقر باقر، تلمیذ حضرت وحید الہ آبادی، مرزا شاغل دہلوی، حضرت وحید الہ آبادی، سید شاہ مبارک حسین رئیس عظیم آباد تلمیذ وحید الہ آبادی، مرزا محمد یوسف حسین ماہر لکھنوی تلمیذ مہدی حسین خان آباد - حضرت داغ کے اعزاز میں جو سب سے پہلا مشاعرہ منعقد ہوا اس کے لئے حضرت وحید الہ آبادی کا یہ شعر مصرع طرح مقرر ہوا ؎

اِدھر آئینہ رکھا ہے اُدھر وہ تن کے بیٹھے ہیں — جو اپنا دیکھنا منظور ہے کیا تن کے بیٹھے ہیں

داغ کو جب مصرعِ طرح معلوم ہوا تو فی البدیہ بیٹھے بیٹھے کاتب کو غزل لکھوا دی، مطلع ملاحظہ ہو:-

بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے کہ وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

مقطع ملاحظہ ہو:-

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتے چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

داغ کی یہ غزل بہت مقبول ہوئی۔ حضرت امیر مینائی نے مسابقت کے خیال سے اس طرح میں ایک غزل لکھی اس کا ایک شعر یاد ہے ملاحظہ ہو:-

نگاہ شوخ و چشمِ شوق میں در پردہ چھنتی ہے
کہ وہ چلمن میں ہیں ہم سامنے چلمن کے بیٹھے ہیں

امیر مینائی نے اپنی غزل کے مقطع میں داغ کی غزل کی تعریف اس طرح کی ہے:-

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
"بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں"

محلہ مغلپورہ شہر عظیم آباد کے ایک منچلے رئیس نے داغ کا امتحان بھی لیا۔ مصرع طرح کا اعلان کر دیا گیا ؎

آباد کبھی خانۂ زنداں نہیں دیکھا

داغ کو قصداً اطلاع نہ دی گئی اور عین وقت پر معذرت کے ساتھ داغ کو لینے کے لئے حاضر ہو گئے۔ داغ نے برجستہ کاتب کو غزل لکھوا دی اور شریک مشاعرہ ہوئے۔ اس غزل کے اکثر اشعار طنزیہ ہیں یہ غزل آفتاب داغ میں موجود ہے۔ اس غزل کے چند طنزیہ اشعار ملاحظہ ہوں:-

ہم جیسے ہیں ایسا کوئی دانا نہیں پایا
تم جیسے ہو ایسا کوئی ناداں نہیں دیکھا

نظروں میں سمایا ہوا ساماں نہیں جاتا
لیلیٰ نے کبھی قیس کو عریاں نہیں دیکھا،

جو دیکھتے ہیں دیکھنے والے ترے انداز
تو نے وہ تماشا ہی مری جاں نہیں دیکھا

جو دن مجھے تقدیر کی گردش نے دکھایا
تو نے بھی وہ اے گردشِ دوراں نہیں دیکھا

کیا داد ملے اس سے پریشانیِ دل کی،
جس بت نے کبھی خوابِ پریشاں نہیں دیکھا

تم منھ سے کہے جاؤ کہ دیکھا ہے زمانہ
آنکھیں تو یہ کہتی ہیں کہ ہاں ہاں نہیں دیکھا

(۲)

دنیا کے ہر بڑے ادیب اور شاعر کی بعض خصوصیات، اس کی اپنی انفرادیت کا نتیجہ ہوتی ہیں ----------

یہی انفرادیت ایک فنکار کو دوسرے فنکار سے الگ کرتی ہے۔ داغ کی انفرادیت اس کے احساس، جوانی اور اس کے لب لہجہ میں مضمر ہے۔ داغ کا یہ انفرادی رنگ بہت مقبول ہوا پورے ہندوستان میں داغ کی پیروی کی جانے لگی۔ داغ کی شاعری دلی، رام پور، اور حیدر آباد کی طرح بہار اور عظیم آباد میں بھی مقبول ہوئی۔ داغ کے بہاری تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس وقت چند مخصوص تلامذہ کے ذکر پر اکتفا کروں گا، بہار میں داغ کے ارشد تلامذہ کے نام یہ ہیں۔ نسیم ہلسوی، ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی، محمد یار خاں خیال رئیس مظفر پور، حضرت سید شاہ حامد حسین صاحب سجادہ نشین تکیہ حضرت شاہ ارزاں قدس سرہٗ اور جناب نظام الدین لجی صاحب۔

(۱) سید نذیر احسن نسیم ہلسوی داغ کے مقتدر تلامذہ میں تھے۔ احسن مارہروی "انشائے داغ" صفحہ ۱۲۵ میں ان کے متعلق فرماتے ہیں:

"نسیم مرحوم ہلسہ ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے اور استاد مرحوم کے بہترین شاگردوں میں تھے"

حضرت نسیم کی چند غزلیں میری نظر سے گزری ہیں۔ آپ کا کلام اپنے استاد کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔ زبان کی صفائی، بیان کی شوخی، محاوروں کی بے تکلفی اور شوکتِ الفاظ جو داغ اسکول کی خصوصیات ہیں آپ کے کلام کے اندر بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ۱۹۱۵ء

میں جب داغ کی جانشینی کا مسئلہ درپیش ہوا تو حضرت نسیم نے اپنے ایک مقطع میں سائل دہلوی کی جانشینی کا اعتراف کرلیا۔ یہ حضرت نسیم کا انکسار تھا جو ہر بہاری کی خصوصیت رہی ہے لیکن اس انکسار پر بھی مقتدر شعرا نے بہار و بنگالہ کے لئے آپ کو داغ کا جانشین تصور کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت شاد عظیم آبادی کے ایک خط کی نقل حاضر کر رہا ہوں:۔

مکرمی۔ تسلیم۔ عنایت نامہ نے ممنون کیا، عزیزی حضرت سائل مد عمرہٗ کا کیا کہنا، ان کے اخلاق کا میں کلمہ گو ہوں۔ آپ نے ایک دفعہ مجھ کو سرفراز کیا تھا، اور شعر بھی سنائے تھے مجھ کو یاد ہے، ہرچند میں موازنہ کی لیاقت نہیں رکھتا مگر صوبہ بہار کیا دور دور تک آپ جانشین داغ کہے جانے کے مستحق ہیں، آپ کی دونوں غزلیں میں نے پڑھیں احسنت احسنت، خدا آپ کو کامیاب کرے۔

حاجی گنج پٹنہ۔ ۲۴ر جنوری ۱۹۱۰ء

نامہ نگار خاکسار
السید علی محمد شاد

اس سلسلہ کی دوسری کڑی شمس العلماء خان بہادر یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی کا ایک خط ہے۔ اس خط کی نقل حاضر ہے۔ کلکتہ ۳۰ر جنوری ۱۹۱۶ء۔

"جناب مولوی سید شاہ نذیر حسن صاحب نسیم بلسوی عظیم آبادی کا کلام میری نظر سے گزرتا رہا ہے اور میں ہمیشہ اس سے مزہ لیتا رہا ہوں۔ نواب فصیح الملک داغ مرحوم کے دوسرے ارشد تلامذہ کے کلام بھی میری نظر سے گزرے ہیں اور میں جناب نسیم کو کسی سے کم نہیں سمجھتا اور میں زور کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تمام ہندوستان میں نہیں تو کم ازکم صوبجات بہار و بنگالہ میں تو یہ اس امر کے مستحق ہیں کہ جانشین حضرت داغ مانے جائیں۔

محمد یوسف جعفری رنجور عظیم آبادی
شمس العلماء خان بہادر

مندرجۂ بالا خطوط سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت نسیم کا مقام کیا تھا۔

(۲) محمد ریاض حسن خاں خیال رئیس مظفرپور، بقید حیات ہیں، اس وقت آپ کا سن ۹۰ سال ہے۔ آپ کا مشغلہ برابر علمی رہا۔ داغ کے متعلق آپ کے پاس کافی مواد موجود ہے۔ داغ کے اکثر خطوط اور داغ کی بیشمار اصلاحیں آپ کے پاس اب بھی محفوظ ہیں۔ اب ضعف اور پیری نے آپ کو کسی کام کا نہیں رکھا۔ آپ کا کلام میری نظر سے گزرا ہے۔ آپ کی دس بارہ غزلیں میرے پاس محفوظ ہیں آپ کے کلام میں استاد کا رنگ نمایاں ہے۔

(۳) حضرت شاہ حامد حسین صاحب حامد ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔ اور ۱۳۶۱ھ میں سجادہ نشین ہوئے۔ شعر و سخن کا ذوق اوائل عمر سے دامنگیر ہے۔ پہلے خواجہ شہرت عظیم آبادی سے اصلاح لیتے تھے پھر حضرت داغ مرحوم سے بذریعہ ڈاک اصلاح لی۔ نواب فصیح الملک کی وفات کے بعد حضرت احسن مارہروی کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ آپ کے پاس حضرت داغ کے چند خطوط اب بھی محفوظ ہیں۔ احسن مارہروی کے بھی بیشمار خطوط آپ کے یہاں محفوظ ہیں۔ راقم کو اکثر خطوط کی زیارت کا موقع ملا ہے۔ مشق سخن کے باعث آپ کا کلام حسن روزمرہ، سادگی، استعارات اور محاورے کے زیور سے آراستہ ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

نکلے جو دل سے آہ تو کیوں کر اثر نہ ہو، ممکن نہیں کہ سنگ سے پیدا شرر نہ ہو
جبیں سائی کو سنگِ آستاں تیرا ہی کافی ہے کسی کے در پہ اپنا یہ سرِ تسلیم کیوں خم ہو
بھر آئیں سب کے دل جوشِ سخن ایسا بھی ہوتا ہے زبان ایسی بھی ہوتی ہے دہن ایسا بھی ہوتا ہے

آپ کا ایک ضخیم قلمی دیوان راقم کی نظر سے گزرا ہے۔ دیوان کے اندر غزلوں کے علاوہ رباعی، سلام، اور نوحے بھی کافی تعداد میں شامل ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کے یہاں تعزیہ داری کی رسم بہت خلوص اور انہماک سے ادا کی جاتی ہے، شہر بھر کے تمام تعزئے اور اکھاڑے آپ کے آستانہ پر آکر اپنی آخری رسم ادا کرتے ہیں۔ آپ کے سلام اور نوحے اکثر تعزیوں اور اکھاڑوں میں مروج ہیں۔

(۴) ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی داغ کے ان تلامذہ میں ہیں جنھوں نے استاد کی روش کو اپنی روش قرار دیا - آپ زندگی کی ۹۰ بہاریں لوٹ چکے ہیں - اب جسم کے ساتھ حواس بھی جواب دے رہے ہیں - ۱۹۵۱ء میں جلوۂ داغ کے نام سے آپ کی غزلوں کا ایک انتخاب شایع ہوا ہے لیکن اکثر اہلِ ذوق حضرات کا خیال ہے کہ مبارک کی اکثر عمدہ غزلیں اس انتخاب میں شامل نہیں، مبارک کی زندگی میں مبارک کا انتخاب شایع ہو اور وہ بھی نامکمل یہ افسوس کی بات ہے -

(۵) سید نظام الدین بلخی شہر عظیم آباد کے باشندہ ہیں - آپ کے والد ماجد ڈاکٹر غیاث الدین بلخی کچھ دن ریاست حیدر آباد میں رہے تھے - نظام الدین بلخی ۱۱ سال کی عمر میں داغ کے شاگرد ہوئے - داغ کے بعد کسی سے پھر اصلاح نہ لی - کلام میں پختگی اور داغ اسکول کی خصوصیات پائی جاتی ہیں - آپ کا ایک قلمی دیوان ترتیب پاچکا ہے لیکن اشاعت کی امید نہیں - نظام الدین بلخی صاحب کو حضرت داغ کی زندگی کے بیشمار چھوٹے چھوٹے واقعات یاد ہیں - داغ کی زندگی کے چند واقعات ملاحظہ ہوں :-

(۱) حیدر آباد کے شاہی محل میں لارڈ الگن وائسرائے ہند کے استقبال کی طیاری ہو رہی تھی - تمام درباری استقبال کے لئے دو گھنٹے پہلے سے دست بستہ کھڑے تھے - حضرت فصیح الملک کو وجع مفاصل کا عارضہ تھا اور بوجہ پیری وہ کمزور بھی تھے کچھ دیر انتظار کے بعد داغ کی طبیعت بگڑی اور انھیں غش آگیا اسی درمیان میں لارڈ الگن وارد ہوگئے - داغ کا ان سے تعارف کیا گیا - یورپ میں شعرا کی بڑی قدر کی جاتی ہے لارڈ الگن نے داغ کو سینہ سے لگالیا - اس واقعہ کے بعد شاہی استقبال کے موقع پر داغ کے بیٹھنے کا انتظام کردیا جاتا -

(۲) ایک بار دسمبر کے آخری عشرہ میں نظام حیدر آباد کے ساتھ داغ بھی کلکتہ آئے - منشی باقر صاحب کو داغ کے کلکتہ پہونچنے کی اطلاع ملی - باقر صاحب نے حضرت داغ کو پٹنہ آنے کی دعوت دی - داغ عظیم آباد کو یاد کرکے بیچین ہوگئے اور جواب میں صرف یہ شعر لکھ کر بھیجدیا :-

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ می دانی
تپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپا را

(۳) ایک بار حضرت داغ جب کلکتہ گئے تو وہاں کی ایک مشہور طوائف سے ان کی خوب ملاقات رہی - طوائف خود بھی شاعرہ تھی - داغ ایک گفتگو میں دو شعر کہہ گئے - طوائف مکالمہ کے اندر شاعری کو نہ سمجھ سکی - کچھ دیر بعد اسے اس کا احساس ہوا اور وہ بہت شرمندہ ہوئی ؎

مجھے کچھ تم سے کہنا ہے مگر کہنے سے ڈرتا ہوں
اجازت ہو تو کہہ ڈالوں کہ جاناں تم پہ مرتا ہوں

بہار کے اندر داغ اسکول کو بہت فروغ ہوا - یہاں کے اس فروغ میں داغ کے صرف بہاری تلامذہ کا ہاتھ نہیں، بلکہ احسن مارہروی نوح ناروی اور سیماب اکبرآبادی نے بھی بہار کے کشت شاعری کی آبیاری کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہار کے اندر داغ کی شاعری کا چراغ اب تک روشن ہے -

پروفیسر ذکی اختر ہاشمی

فلسفۂ قدیم اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں، (۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ - (۲) مادیئین کا مذہب نہایت مفید کتاب ہے - قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول - مینجر نگار

فن کیا ہے؟

فن کا نام آتے ہی بعض اوقات ایک عجیب سی اُلجھن پیدا ہوجاتی ہے اور فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر فن ہے کیا؟ کسے فن کہا جائے اور کسے فن نہ کہا جائے۔ اس لئے کہ جب ہم فن کا نام لیتے ہیں تو ہمارے سامنے ادب۔ موسیقی۔ معماری۔ رقص۔ سنگتراشی باغبانی۔ دستکاری۔ کاشتکاری اور اسی طرح کی معلوم نہیں کتنی چیزیں سامنے آتی ہیں اور اس فہرست کا کوئی رُکن، اعلیٰ و ادنیٰ سے قطع نظر فن سے خالی نہیں ہے، کھیت جوتنا بھی ایک فن ہے، کپڑا بننا بھی فن کی صف میں آتا ہے اور موسیقی، رقص، مصوری کا شمار بھی فن میں ہوتا ہے۔ آیئے ذرا اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔

جمالیات کے ماہرین نے فن کو زیادہ تر چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ۱۔ رسمی ۲۔ مرقعی یا استحضاری ( ) ۳۔ بیانیہ ۴۔ عملی فن (Practical Art) ان میں رسمی، بیانیہ اور مرقعی بہت کچھ ایک سے نظر آتے ہیں اور جنھیں سمجھنے کے لئے ہمیں تھوڑی دیر کے لئے ایک دوسری بحث میں جانا ہوگا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑی چیز جو آتی ہے وہ رسمی اور ہیولائی ہے۔ فن کا بیان زیادہ تر انھیں دو طریقوں پر ہوتا ہے۔ کسی چیز کے پیش کرنے میں ایک تو پیش کردہ چیز کا ہیولیٰ ہوتا ہے اور دوسری اس میں کچھ رسمی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ ہیولیٰ میں مرقع بھی مضمر ہوا کرتا ہے۔ مثلاً کوئی مجسمہ یا تو سنگِ مرمر کا بنا ہے یا کسی فن کی تعمیر میں سنگ و خشت کے بجائے، رنگ و موقلم اور کسی انسانی جسم (جس کی شکل اُتاری گئی ہو) یا کسی سبزہ زار کے عکس سے مدد لی گئی ہے یا صرف صوتی کیفیت اور آواز کے اُتار چڑھاؤ سے اس کی تکمیل ہوئی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ شکل، بھی ہے جس کا عکس اُتارا گیا ہے یا جس کا مجسمہ بنایا گیا ہے۔ اب یہ تین چیزیں بالکل صاف ہیں۔ وہ مادہ جس سے مجسمہ کی تعمیر ہوئی، وہ شکل جس کا عکس اُتارا گیا، وہ چابکدستی جو اس کی تکمیل میں صرف کی گئی۔ چوتھی چیز وہ روح، جذبہ، احساس ہوسکتا ہے جو ان تینوں کی مدد سے مجسمہ یا تخلیق میں سبھرا گیا۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اب ان میں سے فن رسمی اسوقت کہا جائے گا جب اس میں کوئی مادی ہیولیٰ موجود نہ ہو۔ مثلاً موسیقی کے لئے کسی مادی ہیولیٰ کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ صوتی اصول مقرر کرلئے گئے ہیں۔ نغمہ انھیں اصولوں پر سُر۔ تال کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔ یہاں فن صرف مغنّی کی چابکدستی ہے۔ نغمے کا خیال شامل نہیں ہے۔ صرف جذبے کی ایک لہر ہلکی سی ضرور آجاتی ہے۔

دوسری قسم کے فن کی تعبیر کے لئے ہمیں خاص طور سے مصوری کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔ فن کی دوسری قسم استحضاری ہے جسے کسی حد تک مرقعی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اس فن میں کوئی سین، واقعہ، کوئی سانحہ، تاریخی عمارت کی تصویر، کسی پہاڑی منظر کا مرقع پیش کیا جاتا ہے۔ استحضاری فن میں "پیشکش" ضروری چیز ہے۔ پیشکش اپنے خاص مفہوم میں۔ مگر رسمی فن بھی اسمیں شامل رہتا ہے۔ مرقعی فن میں، فنکار کا انتخاب، پیش کردہ شے کی دل فریبی، اس کی ساخت، تناسب اور پھر وہ رسمی فن جسے فنکار کی چابکدستی کہا جائے، شامل رہتی ہے اور آخری چیز جو ان سب کے تناسبی اجتماع سے پیدا ہوگی وہ کسی حد تک حُسن ہے۔ مرقعی فن میں ہیولیٰ اور ہیئت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے صرف رسمیت سے کام نہیں چل سکتا۔

فن کی تیسری قسم، بہت کچھ دوسری قسم سے پیدا ہوتی ہے جسے بیانیہ فن کہیں گے۔ مرقعی فن کی طرح اس میں بھی ہیئت

اور ہیولیٰ دونوں ضروری ہیں۔ مرقعی فن جب کسی تاریخی واقعہ، کسی تلمیح کا حامل ہوجاتا ہے تو وہ بیانیہ فن بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر گوتم بدھ کا مجسمہ مرقعی ہے مگر بدھ کی آخری تصویر جس میں وہ اپنی موت کے وقت اپنے چیلوں کو درس دیتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ بیانیہ فن ہوگیا ہے یا حضرت عیسیٰ کی تصویر مرقعی فن ہے مگر لیونارڈو کی مصوری عشائے آخر (Last Supper) جس میں حضرت عیسیٰ کا وہ تاریخی کھانا دکھایا گیا ہے جو وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ کھا رہے ہیں، 'زہرہ کی پیدائش' (Birth of Venus) یا مائیکل انجلو کا آخری فیصلہ (Last Judgment) کسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں، کسی تلمیح کے حامل ہیں۔ اسے بیانیہ فن کہیں گے۔ ادب، بیانیہ اور مرقعی فنون ہی کے دائرہ میں آتا ہے۔

عملی فن کا شمار سب سے ادنیٰ فن میں کیا جاتا ہے، جس میں کسی بڑے دماغ، کسی بڑے فن کار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ بہت کچھ میکانکی ہوتا ہے، جسے تھوڑا بہت سیکھ کر ہر آدمی فن کار بن جاتا ہے۔ اس میں فطری ملکہ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے سلیقہ کہ لیجئے کاشتکاری۔ دستکاری (جو صرف مشقی اور میکانکی ہو) خطاطی۔ باغبانی۔ نجاری۔ امور خانہ داری۔ ان سب میں نہ اس جذبہ کی ضرورت ہوتی ہے نہ اس تڑپ کی جو مصور، رقاصہ یا موسیقار کے دل و دماغ میں کروٹیں لیتی ہے۔

فن کی ہیئت، تقسیم اور ظاہری شکلوں کے بعد جب اس کے مواد اور ہیولیٰ پر نظر جاتی ہے تو اس سلسلے میں ذراہٹ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ فن کی خوبی اور خرابی کا معیار کیسے قایم کیا جائے۔ اس ضمن میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اچھے اور برے کا انحصار فن کے مواد اور فن کار کے اس انتخاب پر ہے جس کو اس نے اپنے فن سے مزین کرنے کو منتخب کیا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک مصور کسی پہاڑ کے دامن میں غروب آفتاب کا منظر پیش کرتا ہے تو وہ اچھا فن ہے اس لئے کہ فن کا مواد اچھا ہے۔ بشکل دیگر اگر وہ کسی مردہ جانور کی تصویر کشی کرتا ہے جس کو گدھ نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں تو وہ اچھا فن نہیں ہے اس لئے کہ اس کا مواد کریہ المنظر ہے۔ یا کچھ تنگ نظر لوگوں کے نزدیک گوتم بدھ کا مجسمہ اچھا ہوگا خواہ کتنا ہی بدسلیقہ کیوں نہ بنا ہو۔ مگر مونا لیزا کی معصوم مسکراہٹ یا تاج کے مرمریں منارے کوئی وقعت نہیں رکھتے اس لئے کہ وہ دوسروں کا فن ہے یا 'عشائے آخر' دوسرے مذہب کی روایات سے متعلق ہے۔ ایک اچھا فن اور اچھا فنکار ان عیوب سے پاک ہوتا ہے۔ ایک کریہ منظر بھی اتنا ہی حسین ہے جتنا ایک دلفریب نظارہ اگر وہ اپنی حقیقی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ فنکار کی طرز پیشکش فن کی جان ہے۔ اگر کسی فن میں حقیقت کی طرف اس قدر اشارہ ہو کہ دیکھنے والا پیشکش کے اور لوازمات کو بھول کر صرف اس حقیقت کی طرف متوجہ ہوجائے جس کا اشارہ فن کار کر رہا ہے تو فن اور فن کار دونوں عروج کی آخری منزل تک ضرور پہونچ جاتے ہیں۔ جیسے مونا لیزا کے شاہکار کو دیکھ کر عورت، اس کا جسم، قد و قامت سب فراموش ہوجاتے ہیں اور دیکھنے والا صرف معصوم ہنسی سے مبہوت ہوجاتا ہے۔ ہارس ایٹ ایز (Horse At Ease) میں ذہن، گھوڑے کی ٹانگوں، سموں اور بدن کے جھکاؤ کی طرف مبذول ہوتا ہے۔ فن کا ہیولیٰ اور اس کی تعمیر در اصل وہ مواد، وہ پیشکش ہے جسے فن کار نے پیش کیا ہے۔ مٹی۔ پتھر۔ لوہا یا رنگوں کی پیالیاں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔

ادب کے سلسلہ میں جب فن کا سوال آتا ہے تو بہت سے دھوکے پیدا ہوجاتے ہیں کچھ لوگ فن کا مقصد، صرف الفاظ کی تراش خراش، لفظوں کی بندش، بحر، ردیف قافیہ کا محض التزام سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ نثر میں بھی فنکاری کا تقاضا کرتے ہیں کچھ نثر کو فن کے لئے مناسب نہیں سمجھتے۔ فن ان کے نزدیک صرف شاعری ہی میں مل سکتا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ فن، نثر نظم سب میں ہوتا ہے صرف مقررہ اصول ہی نہیں بلکہ وہ روح وہ جذبہ بھی کام کرتا رہتا ہے جو ہر فن کی جان ہے۔ شاعری کے سلسلے میں فن، الفاظ کے انتخاب، ردیف، قافیہ، بحر، موسیقیت اور سب سے زیادہ اس مواد میں ہوتا ہے جو پیش کیا گیا ہے اور طرز پیشکش جس میں مواد ڈھالا گیا ہے۔ مقالات اور مضامین میں فن اس مقصد کے اتمام میں پوشیدہ ہوتا ہے جس کے

لئے وہ لکھا جارہا ہے اور وہ طرزِ ادا جس کے ساتھ وہ پیش کیا گیا ہے۔ ناول اور مختصر افسانوں میں فن، کردار نگاری، پلاٹ، ارتقاء، منتہیٰ، اختتام اور مواد و طرزِ پیشکش میں مخفی ہے، ایسا مواد جو کہ مادّی ہو، جسے انسانی حیات سے علاقہ ہو اور اس بات کا اطلاق پورے ادب پر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ادب کا تعلق جتنا براہ راست زندگی سے ہے اتنا تعلق اور کسی دوسرے فن لطیف کا نہیں ہے۔

ایک محدود طبقہ کے نزدیک ادبی فن اور ادبی محاسن کے معنی ہی بالکل مختلف ہیں۔ ادب کا مطلب اول تو اس طبقہ کے نزدیک صرف شعر خوانی ہوتا ہے جس میں فن صرف لفظی بازیگری۔ ردیف قافیہ کا کھٹکا۔ صنعت لفظی۔ بندش وغیرہ ہوتا ہے مگر یہ خیال صرف تُشاعر اور چند نام نہاد ادیب نما لوگوں کا ہے جو ادب کا اصل مفہوم نہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب نہ صرف شعر و شاعری ہے اور نہ فن سے مراد صرف ردیف، قافیہ، الفاظ کی تراش خراش اور صنایع لفظی ہیں۔ ——

ادب میں ناول، افسانہ نگاری، داستان، نثر سبھی کچھ شامل ہے اور ان سب چیزوں میں فنکاری موجود ہوتی ہے مگر ادب کے لئے پہلی اور سب سے ضروری چیز مواد ہے جس کی بنیاد کسی مادی خیال پر رکھی گئی ہو باقی چیزیں صرف مشاطگی کا کام کرتی ہیں۔ انسانوں کا ادب انسانی زندگی کا عکس ہے اور اس لئے اس ادب کا مواد انسانی سماج ہی اکٹھا کرتا ہے اور پھر اس کو فنکاری کی سان پر چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ ماحول اور سماج ادب کی جان اور ادیب کا دماغ ہیں اور سماج و ماحول میں خوبیاں بھی ہوسکتی ہیں، خرابیاں بھی۔ ادب کا مقصد زندگی کو سنوارنا ہے، اس سے منھ چرانا نہیں۔ اس لئے خوبی و خرابی سبھی کچھ پیش کی جاتی ہیں مگر دیانتداری شرط ہے خرابی پیش کرنے یا اس کا مذاق اُڑانے میں اگر اصلاح مقصود ہے تو ایسی خرابی کے بیان کرنے میں چنداں ہرج نہیں مگر جب اس خرابی کو اور گندگی بنا کر محض ذہنی تعیش کے لئے پیش کیا جاتا ہے تب وہ یقیناً تخریبی ہوجاتی ہے جس کا مقصد محض شرارت اور بدمعاشی کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اب یہ غلطی خواہ کسی بھی اسکول کے ماننے والے سے سرزد ہو۔

ادب کی فنی خصوصیت کا ایک پہلو حقیقت نگاری بھی ہے مگر صرف دو اور دو چار والی حقیقت، سائنسی ہوجائے گی اگر فنکار اس کو اپنے تخیل کے سحر میں غرق نہیں کرتا۔ فنکار کے لئے ادب میں سب سے بڑی مشکل یہیں آپڑتی ہے۔ اسے حقیقت سے بھی کنارہ کش نہ ہونا چاہئے اور ساتھ ہی ساتھ پیشکش ایسی ہو جس نے تخیل و محسوسات کی مدد تو لی ہو مگر ہوا میں معلق نہ ہوگئی ہو۔ فلسفہ اور سائنس حقیقت کلی پر یقین رکھتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی دنیا میں ادبی فن کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ اس کو حقیقت سے گریزاں اور بے عمل کہا جاتا ہے۔ سائنس کی دنیا میں رات صرف ایک مقررہ وقت کے بعد غروب آفتاب پر جب تاریکی پھیل جائے اس کا نام ہے مگر ادب کی دنیا میں فنکار کی رات اس سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے، اس سے میخانے میں چلنے کو کہتی ہے کسی لالہ رخ کے کاشانے کی طرف اس کا دامن کھینچتی ہے۔ اب یہ واقعہ حقیقت سے دور بھی نہیں ہے۔ انسانی دماغ میں بعض اوقات یہ خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ سائنس بھی فن ہے اور ادب بھی اور یہ دونوں فن بھی ایک دوسرے میں اس طرح سموئے ہوئے ہیں کہ الگ نہیں کئے جاسکتے۔ ادب کو سائنٹفک ہونا چاہئے جبکہ سائنس پر ادب کے بھی اصول قایم کئے جاتے ہیں

فن کو صرف ادب، صرف شاعری نہ سمجھ کر اگر اس کے وسیع معنی میں اسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو یہ ضروری ہے کہ اس بات پر نظر رکھی جائے کہ لفظ فن کا استعمال کس ضمن اور کس موقع پر ہوا ہے۔ اب اگر 'فن' موسیقی کے سلسلہ میں آیا ہے تو وہاں اس سے مراد آواز۔ سر تال، نغمہ، راگ، راگنی، لہجہ کا اتار چڑھاؤ اور پھر اس کے بعد وہ گیت ہے جس پر موسیقی کے ان لوازمات کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اور پھر گیت میں وہ جذبہ جو کسی گیت یا نغمہ کو موثر بناتا ہے۔ اگر حقیقت بیں نظروں سے دیکھا جائے تو موسیقی کی روح وہی جذبہ ہے۔ اور پھر گیت میں سمویا ہوا ہے اور جو موسیقی کے اور لوازمات کے ساتھ مل کر دل پر ایک چوٹ مارتا ہے (اسی طرح صرف ساز سے پیدا کی ہوئی موسیقی INSTRUMENTAL MUSIC میں) اگر یہ روح موجود نہیں تو فنِ موسیقی کا ظاہری فن اور صرف اصول، جذبات کو برانگیختہ نہیں کرسکتے۔ قوت سامعہ شاید متلذذ ہوجائے

مثال کے لئے ہم مضطر خیر آبادی کا مشہور شعر لئے لیتے ہیں :-

اسیرِ پنجۂ عہدِ شباب کرکے مجھے
کہاں گیا مرا بچپن خراب کرکے مجھے

اب اس شعر میں جو تاسف، کرب ملی ہوئی خواہش اور تڑپ موجود ہے وہ موسیقی کی سان پر چڑھ کر جتنا اثر پیدا کرے گی اتنا

گراکے غار کی تہ میں اکیلا پاکے مجھے
چلا گیا وہ منڑ خاں رلا رلا کے مجھے

سے

میں نہیں پیدا ہوسکتی چاہے موسیقی کے فن کا اظہار انتہائی بلندی کے ساتھ کیوں نہ کیا جائے۔ سامعہ تو لذت حاصل کرے گا مگر وہ بھی ظاہری ہوگی اس لئے کہ سامعہ پر بھی جذبات اثر انداز ہوتے ہیں۔ موسیقی، سا۔ رے۔ گا۔ ما سے زیادہ اس احساس کا نام ہے جو مغنّی کے دل میں کسی جذبہ کے تحت پھوٹ پڑتا ہے اور ساز ہاتھ سے زیادہ دل سے بجایا جاتا ہے۔

اسی طرح رقص، صرف آگے بڑھنے، پیچھے ہٹنے، جسم کی گردش، اعصاب کی مختلف جنبشوں کا نام نہیں بلکہ رقص کی روح رقاصہ یا رقاص کا وجود اور اس کے جذبات ہیں۔ کم از کم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ رقص کا ہیولیٰ اور رقاصہ یا رقاص کا جسم بالکل دو الگ چیزیں ہیں ل۔ رقص کے لئے اگر رقاصہ کے حرکات و سکنات ہی کافی ہوتے تو کٹھ پتلی یا کسی بھی میکانکی رقص میں زیادہ دلفریبی ہوتی اور اگر رقاصہ یا رقاص کی جاذبیت رقص پر اثر انداز نہ ہوتی تو ہر آدمی تھوڑے سے اصول سیکھ کر رقص کر سکتا تھا۔ ادا، یا طرز ادا، جس کا نام ہے وہ نہ کٹھ پتلی میں پیدا ہوسکتی ہے نہ اصول رقص میں۔ صرف ظاہری فن کہیں بھی کام نہیں دیتا اگر مواد موجود نہ ہو ایسا مواد جس میں مادی لطافتیں موجود ہوں — فن اور مواد ایک دوسرے کے لئے ہر میدان عمل میں لازم و ملزوم ہیں۔ حسن صرف تناسب کا نام نہیں ہے بلکہ اس شے کا نام ہے جو تناسب کے یکجا ہونے پر پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر رقاصہ کا فن، اس کا جسم اور اس جسم میں زندگی اور اس زندگی کے اظہار کی قوت نہ ہوتی تو نہ وہ فن پیدا ہوتا جسے ہم رقص کہتے ہیں نہ وہ حسن جو کسی مخصوص رقص کو اپنی صف میں ممتاز کرتا ہے۔

مصوری کے سلسلہ میں بھی خیال کو صرف ثانوی بلکہ اس سے بھی کم اہمیت حاصل ہے۔ مصوری کے لئے ضروری ہے کہ مصوّر میں قوتِ مشاہدہ زبردست قسم کی ہونی چاہئے۔ ذہن میں مختلف قسم کے رنگوں کے اثرات سے کیفیت پیدا ہونے کی صلاحیت موجود ہو باریک بیں اتنا ہو کہ ہر فطری اور مصنوعی پیشکش کی تہ تک پہونچ جائے۔ طبیعت ایسی حساس ہو جس کے خمیر میں مناظر فطرت حل کردئے گئے ہوں اور جس کے لئے یہ مادی دنیا ایک منظر ہو۔ اسی طرح سنگتراشی، مجسمہ سازی، ہر ایک کے لئے کچھ میکانکی اصول اور واجبات ہیں جن کے تذکرے میں کوئی دلکشی اس موقع پر پیدا نہ ہوگی۔

اعلیٰ فنون کے بارے میں یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اعلیٰ فنون کی تخلیق کہیں الگ سے یک بارگی نہیں ہوجایا کرتی۔ اس کی اساس بالکل ادنیٰ فن پر قایم ہے۔ پیراڈائز لاسٹ۔ اینیڈ۔ الیڈ۔ شاہنامہ۔ مراثی انیس کا وجود قلم کی گردش، خطاطی الفاظ، جملے، نشست، علم البیان جیسے چھوٹے چھوٹے فنون کی مدد اور ان کے اجتماع ہی سے ہوا۔ تاج کے منارے، موتی مسجد کی سادگی، مدورا کے منادر، اجنتا اور ایلورا کی اپسرائیں۔ آخری فیصلہ، مائیکل اینجلو کا فن ٹیٹن۔ مانی۔ بہزاد کی مصوری و نقاشی بھی موقلم، رنگوں کی پیالیاں اور سنگتراشی کے ابتدائی اوزار کی مرہونِ منت ہیں اور یہ ابتدائی چیزیں ادنیٰ فن کا ایک جزو ہیں جو اعلیٰ فنون کی تخلیق کا باعث بنتی ہیں — اس طویل بحث کے بعد جب فن کو ہم بہ حیثیت مجموعی دیکھتے ہیں تو بیساختہ ہماری زبان سے یہی نکلتا ہے کہ فن مادی حسن کی نقالی کا نام ہے۔

سید محمد عقیل

ل The body of the dancer is not the body of the dance but the body of the dance is created from sequence of bodily gestures:— Musical Studies by Earnest NewMAN

مومن کا فارسی کلام

حکیم مومن کی فارسی شاعری کے متعلق نہ تو آج تک وضاحت سے کسی نے کچھ لکھا اور نہ عام طور سے دنیا کو معلوم کہ مومن خاں کی کلیات فارسی کن اصناف سخن پر مشتمل ہے غالباً میں بھی اس سے بیخبر ہی رہتا اگر مجھ کو قسمت سے مومن خاں کے فارسی کلام کا مجموعہ نہ مل جاتا۔ مجھے جب یہ نسخہ دستیاب ہوا تو میں نے اکثر محققین سے ذریعہ خطوط معلوم کیا کہ مومن خاں کے کلیات کے متعلق اُن کی کیا رائے ہے، لیکن قریب قریب سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ نادر نسخہ مومن خاں کے پاس سے مجھ تک کس طرح پہونچا۔ اس نسخہ مجھ تک پہونچنے کا ذریعہ نواب وزیرالدولہ صاحب بہادر والیِ ٹونک ہیں۔ جو میرے پردادا صاحبزادہ عباداللہ خاں کے بھائی تھے --- نواب وزیرالدولہ والیِ ٹونک سے چونکہ مومن خاں کے خاص تعلقات تھے اس لئے مومن خاں نواب صاحب سے اکثر خط و کتابت کرتے رہتے تھے۔ مومن خاں سے ابتدائی تعلقات نواب صاحب کے اسوقت ہوئے جبکہ نواب صاحب ایک عرصہ تک اتفاقاً دہلی میں مقیم رہے۔ بہادر شاہ بادشاہ چونکہ نواب وزیرالدولہ صاحب کے خالو تھے اس لئے اکثر دہلی کے باکمال لوگوں سے اُن کی رسم و راہ ہوگئی جن میں ایک مومن خاں بھی تھے۔ مومن خاں نے نواب موصوف کے لئے کچھ قصاید بھی لکھ کر روانہ کئے تھے۔ ایک قصیدہ کلیات مومن (اُردو) میں درج ہے جس کا مطلع ہے:- "یادِ ایامِ عشرتِ فانی ؛ نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی"

انھیں ایام میں یہ نسخہ بھی نواب وزیرالدولہ کو مومن خاں نے بطور نذر روانہ کیا تھا۔------

------مومن خاں اور نواب وزیرالدولہ میں خاص تعلقات پیدا ہوئے ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں ایک ہی پیر کے مرید تھے۔ جس زمانہ میں یہ نسخہ روانہ کیا گیا، اُس وقت چونکہ میرے پردادا کو بھی شاعری سے شغف تھا اس لئے انھوں نے نوابصاحب سے نسخہ ہذا کو مانگ لیا۔ میرے پردادا کے انتقال کے بعد یہ نسخہ میرے دادا کے پاس رہا اُن کے بعد میرے والد مرحوم کے ورثہ میں آگیا۔ لیکن یہ نسخہ کس طرح والد صاحب کے پاس سے گم ہوگیا اور ایک عرصہ تک گم رہا لیکن والد صاحب کی وفات کے قریب دس سال بعد ایک روز بازار میں فروخت ہوتا ہوا دیکھا گیا۔ میرے بزرگ مولانا احمد حسن صاحب جو مومن خاں سے خاص عقیدت رکھتے ہیں، انھوں نے اس نسخہ کو خرید لیا اور میں نے ان سے لیا۔

نسخہ کی خصوصیت نسخہ میں خاص خصوصیت یہ ہے کہ جہاں جہاں کاتب سے غلطیاں ہوئی ہیں، وہاں مومن خاں نے خود اپنے قلم سے اُن کی اصلاح کی ہے، ایسی اصلاحیں نسخہ میں پچاس ساٹھ جگہ موجود ہیں۔ اگر کسی غزل یا قصیدے یا تاریخ میں کوئی شعر رہ گیا ہے تو بعد میں اس کا اضافہ مومن خاں نے خود اپنے قلم سے کیا ہے۔ اس کے علاوہ جو آٹھ تاریخوں رباعیوں کا نسخہ روانہ کرتے وقت اضافہ کیا گیا ہے وہ بھی مومن خاں نے خود اپنے ہی قلم سے کیا ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ تاریخ وفات خواجہ محمد نصیر مرحوم (نواسہ خواجہ میر درد قدس سرہٗ)

۲۔ تاریخ وفات عبداللہ عرف مغلجان وکیل عدالت دیوانی دہلی۔

۷۳ تاریخ بوہ پردازی در عہد محمد بہادر شاہ بادشاہ -
۷۴ تاریخ ریش تراشیدن دبیرالدولہ
۷۵ دیگر
۷۶ کتخدائی برادر زادۂ خود عبدالرحمٰن
۷۷ " نامعلوم
۷۸ " نامعلوم

تفصیل اصناف سخن قصاید چھ، غزلیں ایک سو پندرہ، رباعیاں ایک سو بچپن، تاریخیں ایک سو ہیں اور کل صفحات ایک سو چھیانوے - ایک قصیدے کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں :-

گر چنیں است گردشِ افلاک ۔۔۔ زود چو گنج میروم در خاک
زارم از عشق ظالمے کہ ازو ۔۔۔ ہم فلک کردہ ظلم استراک
دلِ بریاں و خاطرِ مایوس ۔۔۔ جانِ نمناک و دیدۂ نمناک
باتب و تاب آتشِ ہجراں ۔۔۔ آنچناں کہ شعلہ و خاشاک
ہستیم کار کردہ بر من تنگ ۔۔۔ دارم از لطفِ مرگ چشم ہلاک
تا رود آب در حضیض زمیں ۔۔۔ تا کند نخل سر سوئے افلاک
دشمن و دوستِ تو مائل باد ۔۔۔ بہ نشیبِ ثریٰ باوجِ سماک

غزل مومن خاں کی غزل کا انداز جس طرح اُردو میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے اسی طرح فارسی میں بھی وہ کسی بات کو معمولی طرح نہیں کہتے وہ اپنا خیال پیچیدگی کے ساتھ بیان کرتے ہیں لیکن زبان و بیان کی سلاست حلاوت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے انھیں خصوصیات کی بنا پر اُن کا فارسی کلام ایک خاص مرتبہ رکھتا ہے -

مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :-

یار گر خواست کہ عاشق نہ رسد تا سر کو ۔۔۔ راند اول ز در خویش نگہبانش را

مومن خاں محبوب کے دربان سے چونکہ بدگمان ہیں اسلئے اظہار بدگمانی نہایت لطیف پیرایہ میں کیا ہے

ناصح کہ چاکِ دامنِ من بخیہ میزند ۔۔۔ یارب نہ بیند آں صنمِ جامہ زیب را

یہاں مومن خاں کو اپنے ناصح مشفق سے خوفِ رقابت پیدا ہوجاتا ہے - اور وہ نہیں چاہتے کہ ناصح اُن کے صنم جامہ زیب کو دیکھے - رشک اور خوفِ رقابت کے ساتھ ساتھ، شعر سے ایک لطف طنز کا پہلو بھی نکلتا ہے - یعنے ناصح مشفق اُسی وقت تک میری بخیہ گری میں مصروف ہے اور اسی وقت تک مجھے نصیحت کر رہا ہے جب تک کہ اُس نے میرے محبوب کو نہیں دیکھا ہے - جب وہ اُسے دیکھ لیگا تو یقیناً وہ بجائے میرے اپنے دامن کی بخیہ گری کی فکر کرے گا - اسلئے بہتر ہے کہ وہ میرے صنمِ جامہ زیب دیکھے ہی نہیں -

دل را فریب وعدہ بدہ گو وفا مکن ۔۔۔ شاید تسلی شود ایں ناشکیب را

اللہ رے مجبوریِ عشق کہ دل کی خاطر دانستہ فریب کھانا گوارا کرتے ہیں اور محبوب سے فریب دہی کی التجا کسقدر موثر الفاظ کرتے ہیں -

نہ از کیں میشگافد آں ستمگر سینۂ مارا ۔۔۔ کہ بہر آرزوے خویش خالی میکند جا را

مومن کے یہاں دیگر خصوصیات کے علاوہ ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محبوب کو کسی حالت میں موردِ الزام ٹھیرانا نہیں چاہتے - بلکہ اُس کی ہر جفا کو وفا سمجھتے ہیں اور اُس کی دشمنی اور عداوت کو دوستی تصور کرتے ہیں - محبوب کی بیگانہ روی کے زخم دل پر پے در پے کھاتے ہیں اور پھر بھی لذتِ یگانگت محسوس کرتے ہیں -

در رنجِ زندگی بخیالِ عدم خوشم یادِ وطن زدرد فزاید غریب را

مومن انتہائی عالم یاس میں بھی مسکراتے ہیں ہر غم میں اُن کی زندہ دلی کسی نہ کسی صورت سے کوئی خوشی کا پہلو نکال ہی لیتی ہے گو دنیا کی بے ثباتی کی تصویر الفاظ سے کھینچ رہے ہیں اور عارضی قیام گاہ کو مستقر دائمی پر ترجیح دے رہے ہیں ------ لیکن رنجِ زندگی کو تکلیفِ مسافرت قرار دے کر تصورِ عدم سے خرم و شادکام ہیں -

نکاہش غمش اندر وطن غریب شدم کہ ہیچکس نشناسد دریں دیار مرا،

وطن میں رہ کر اپنے غریب الوطن ہونے کا کس قدر مکمل ثبوت دیا ہے -

رحمے چہ میکنی بگمانِ جنونِ شوق، پیراہن رقیب قبا کردہ ایم ما

اس شعر میں مومن خاں کا ذوقِ شعری اپنے اصلی خدوخال میں نمایاں ہے وہ محبوب کی نگاہ سے رقیب کا اعتبار کھونے کے لئے اوس کا سا روپ بدلتے ہیں اور وہ جب اُن پر رحم کھاتا ہے تو اصل واقعہ کا اظہار کرتے ہیں - یعنی اُس کو متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ رقیب کا جنونِ شوق رقیب کے لئے جو تیری مہربانی اور رحم کی وجہ بنا ہوا ہے وہ فرضی ہے اور رقیب صرف تیری مہربانی حاصل کرنے کے لئے اور تجھے اپنی محبت میں مبتلا کرنے کے لئے جنونِ شوق کا ڈھونگ رچائے ہوئے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب میں رقیب کا بھیس بدل کر اور اُس کی قبا پہن کر تیرے سامنے آیا تو تو مجھ پر بھی رحم کرنے پر مجبور ہو گیا -

از کفِ دشمن گرفتم جام را می شناسم گردشِ ایام را

چونکہ علم ستارہ شناسی میں مومن کو ید طولےٰ حاصل تھا اس لئے اُن کی نظر گردشِ دوراں کا اچھی طرح جایزہ لے سکتی تھی، چنانچہ مومن خاں کا یہ کہنا کہ "می شناسم گردشِ ایام را" میرے خیال میں غلط نہ ہوگا، شعر سے ظاہر ہے کہ انھوں نے اپنی زمانہ شناسی کا ثبوت بطریقِ احسن پیش کیا ہے - اور اس کے ساتھ ساتھ "زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز" کی تشریح - جس جامعیت کے ساتھ کی ہے وہ قابلِ داد ہے، لفظ "دشمن" سے جو تغزل شعر میں پیدا کیا گیا ہے وہ بھی صرف مومن خاں ہی کا حصہ ہے - مومن خاں دشمن کے ہاتھ سے جام لیکر سیر نہیں ہوتے، کیونکہ وہ تمام میخانے کی شراب کو اپنا ہی حق سمجھتے ہیں یا کہئے کہ دوسرے کو اس کا اہل نہیں سمجھتے -

شکستنِ دلِ صیاد چوں روا دارم فگند دام و قفس تا کند شکار مرا

اسے مقتضائے عاشقی کہئے یا مومن کی فطرت یا افتادِ طبیعت کہ وہ دانستہ مصیبت میں پھنسنا چاہتے لیکن کسی کی دل شکنی کرنا گوارا نہیں کرتے - اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں :-

ز شوقِ جورِ تو در خویشتن نمی گنجم چہ غم کہ تنگیِ عالم دہد فشار مرا

تنگیِ عالم کے جملہ کی جامعیت ملاحظہ ہو کہ ایک جملہ سے دو معنے پیدا کئے گئے ہیں - ایک جگہ تنگی کے لفظی معنے اختصار اور کمی کے لئے گئے ہیں تو دوسری جگہ اصطلاحی معنے رنج و ابتلا کے لئے گئے ہیں - یہ امر مسلم ہے کہ جو شخص اپنے آپ میں نہیں سما سکتا وہ از خود رفتہ ہے اور بحالت از خود رفتگی تنگیِ عالم کا اُس کو کچھ غم نہیں ہوسکتا یعنے عالم از خود رفتگی نے تنگی اور کشادگی تکلیف اور مصیبت کا احساس ہی اُس کے دل سے کھو دیا ہے - اس لئے اُس کو تنگیِ عالم محسوس ہی نہیں ہے -

اب میں کچھ ایسے ہم طرح اشعار پیش کرتا ہوں جو دوسرے شعرا کے یہاں انھیں قوافی میں پائے جاتے ہیں :-

غالب، مومن

غالب :- دل مایوس را تسکیں بمردن میتواں دادن — چہ امید است آخر خضر و ادریس و مسیحا را

غالب کو دل مایوس کے مرض سے اس قدر مایوسی ہے کہ تسکینِ مسیحا و ادریس و خضر سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ اور وہ مزید اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔

مومن :- مپرس از چارہ سازیہا زپرسش بیشتر سوزم — تپے دارم کہ اعجازش نفس سوز و مسیحا را

مرض کی نوعیت اور شدت دونوں پر جس خوبصورتی سے روشنی ڈالی گئی ہے ظاہر ہے یہ کلیہ ہے کہ اگر کسی مایوس مریض کی مزاج پرسی کی جائے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مایوسی کی بنا پر مریض آب دیدہ ہو جاتا ہے یہی پرسش احوال مرض میں شدت و اضافہ کا باعث ہو جاتی ہے۔ اسی کلیہ کو مومن خاں نے بہت خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

غالب :- غالب رسیدہ ایم بکلکتہ و بے — از سینہ داغ دوریٔ احباب شستہ ایم

غالب کلکتہ پہونچ کر اپنے دل سے دوستوں کی جدائی کا غم بھلا بیٹھے ہیں۔ لیکن مومن خاں کہتے ہیں :-

مومن :- تا آب گشتہ ایم زشرمِ نفاقِ خلق — گردے ز دامنِ دلِ احباب شستہ ایم

مومن خاں کا احساسِ غیرت و ایثار قابلِ ملاحظہ ہے کہ وہ دنیا کے نفاق کی وجہ سے شرم سے پانی پانی ہو کر اپنے احباب کے دل سے آپس کی کدورت دھو رہے ہیں

غالب :- راہیست کہ در دل فتد از خوں رود از دل — ناید بزباں شکوہ و بیروں رود از دل،

شعر خوب ہے لیکن اب اسی قافیہ میں مومن کا مطلع بھی ملاحظہ فرمائیے :-

مومن :- گر دل ہمگی خوں شود و خوں رود از دل — مشکل کہ تمنائے تو بیروں رود از دل

کہتے ہیں کہ اگر غم سے دل خون ہو کر بھی بہ جائے تو بھی مشکل ہے کہ تیری تمنا دل سے دور ہو۔

اب کچھ اشعار نظیری نیشاپوری اور غالب کی اُن مسلسل غزلیات کے پیش کئے جاتے جو تینوں شعرا نے ایک ہی زمین میں کہی ہیں۔ یہ غزل نظیری کی اُسوقت کی معلوم ہوتی ہے جب نظیری کا محبوب کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے۔

نظیری، غالب اور مومن

نظیری :-

چشمش براہے میرود مژگانِ نمناکش نگر — در سینہ دارد آتشے پیراہنِ چاکش نگر
شرم از میاں برخاستہ مہر از دہاں برداشتہ — گفتار بے ترسش ببیں رفتار بیباکش نگر
از کوئے معشوق آمدہ شوریدگاں در حلقہ اش — از صیدِ آہو میرسد شیراں بفتراکش نگر

غالب :-

در گریہ از بس نازکی رخ ماندہ بر خاکش نگر — واں سینہ سودن از تپش بر خاک نمناکش نگر
برتے کہ جانہا سوختے دل از جفا سردش ببیں — شوخے کہ خونہا ریختے دست از حنا پاکش نگر
آں سینہ کز چشمِ جہاں مانندِ جاں بودے نہاں — اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر
بر مقدمِ صید افگنی گوشے بر آوازش ببیں — در بازگشتِ توسنے چشمے بفتراکش نگر

مومن :-

بسمل شد و جلاد تر انداز بیباکش نگر — خورد آب پیکانِ بلا مژگانِ نمناکش نگر

خاکے بدل افتادہ ام در زلفِ عنبر بیز ہیں — گردے بدل بنشستہ ام بر دامن پاکش نگر
شوخے کہ از ناز و ادا نشنید احوال کسے — دادِ تظلم میدہد افغان بیباکش نگر
اکنوں برائے بوالہوس صد زخمِ کاری میزند — آں دستِ نازک را ببیں پیراہن چاکش نگر

نظیری، غالب، مومن، تینوں ہی نے اپنے اپنے اشعار میں محبوب کی عاشقانہ بیتابی اور بے قراری کا اظہار کرتے ہوئے اپنا اپنا زورِ بیان اور کمالِ شاعری دکھایا ہے۔ لیکن نظیری کے مطلع سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ جملہ اشعار معہ مطلع محبوب کیلئے مخصوص کردئے گئے ہیں۔ "گوش" کی ضمیر سے خیال اس طرف جاتا ہے لیکن واضح طور پر نہیں۔ غالب نے اپنے مطلع میں لفظ نازکی کہکر اس کمی کو پورا کردیا ہے، علیٰ ہذا مومن خاں نے یہی لفظ "جلاد" مطلع میں کہکر جملہ اشعار کے مجموعی مفہوم پر پوری طرح روشنی ڈالدی ہے۔ ان قوافی کے علاوہ دوسرے قوافی بھی مومن نے نظم کئے ہیں جو نظیری کے یہاں تو نہیں ملتے البتہ غالب کے یہاں ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

غالب:- برآستانِ دیگرے درشکرِ دربانش ببیں — در کوئے از خود کمتری در رشک خاشاکش نگر
خواند بہ امیدِ اثر اشعارِ غالب ہر سحر — از نکتہ چینی در گزر فرہنگ و ادراکش نگر

مومن:- گر نیم نازے میکشد صد طعنہ بر من می زند — با بیخودیہائے جنوں در ہوش ادراکش نگر
در سجدہ آخر تاکجا نالیدن از دستِ صنم — مومن جبینے ہمچو گل مالیدہ بر خاکش نگر

پختگیِ بیان اور سلاستِ زبان کے اعتبار سے نظیری، غالب، مومن تینوں کے اشعار کو اگر ملا دیا جائے تو ذرہ برابر فرق معلوم نہیں ہوتا کہ ایرانی شاعر کے کون سے اشعار ہیں ہندوستانی شعرا کے کون سے ہیں۔

ایک اور زمین ہے جس میں عبدالرحیم خانخاناں اور نظیری دونوں کا مقابلہ شبلی نے شعر العجم میں کیا ہے یہ امر مسلم ہے خانخاناں کی غزل اپنی کیفیت تغزل کے لحاظ سے اپنا جواب خود آپ ہے، بیشک نظیری کا کوئی شعر ایسا نہیں جو خانخاناں کی غزل کے ساتھ پڑھا جاسکے۔ اسی زمین میں غالب اور مومن کی بھی غزلیات ہیں، خانخاناں کی غزل کو چھوڑکر باقی تین شعرا کے ہم قافیہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں صاحبانِ ذوق و نظر خود فیصلہ کریں کہ نظیری اور غالب نے کیا کہا ہے اور مومن خاں نے انھیں قوافی کو کس طرح نظم کیا ہے

نظیری:- درازدستیِ حسن کہ گل بہ چشم ریخت — کہ تا بدامنم از جیب در شکر خند ست
غالب:- نگاہِ مہر بدل سرندادہ چشمہٗ نوش — ہنوز عیش باندازۂ شکر خند ست

نظیری کہتا ہے کہ حسن کی دراز دستی نے وہ پھول کھلادئے ہیں یعنے (آنکھوں میں وہ اشک خونی پیدا کردئے ہیں) کہ جن کی وجہ سے جیب سے لیکر دامن تک مسکراہٹ ہی مسکراہٹ ہے۔ شکر خند کے معنے تبسم اور ہنسی کے ہیں، اس لئے چاک جیب کو بھی شکر خند یعنے مسکراہٹ ہی کہا گیا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ مجھے باوجود محبوب کے التفات کے مکمل مسرت میسر نہیں ہے اور میرا ابھی عیش تبسم تک محدود ہے۔

اب اسی قافیہ میں مومن خاں کہتے ہیں:-

بہ تلخکامیِ من ذوقِ وصل گریاں باد — دمے کہ زہر چکانم لبِ شکر خند ست

مفہوم کی ندرت کے ساتھ ساتھ مومن کے شعر میں جو تغزل پایا جاتا ہے وہ نظیری اور غالب دونوں کے اشعار کے تغزل سے مرجح حیثیت رکھتا ہے۔ ذرا پیوند کا قافیہ بھی ملاحظہ ہو:-

نظیری:- بحرفِ اہلِ غرض قرب بعد مانند ست — دلِ شکستۂ ما را ہزار پیوند است

غالب :- دراز دستیِ من چاکِ ازفگند چہ عیب — زبیش دلق ورع باہزار پیوند است

مومن :- بصلح آمدو شوق وصال میکشدم — شکستہ آہ وے راکہ دیر پیوند است

نیاز صاحب نظیریؔ کے شعر کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں نظیری کے شعر کا پہلا مصرعہ اُلجھا ہوا ہے۔ میرے خیال میں پہلا مصرعہ ہی نہیں بلکہ پورا شعر اُلجھا ہوا ہے۔ غالبؔ نے بھی دوسرے مصرعہ میں "چہ عیب" کہکر عیب نہ ہونے کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اگر نظیریؔ کے دوسرے مصرعہ میں دل کو ہزار پیوند کہا گیا ہے تو غالبؔ نے دلق کو ہزار پیوند کہدیا لیکن دونوں نے کوئی بات پیدا نہیں کی۔ مومنؔ خاں کے شعر کا دوسرا مصرعہ اپنی معنویت کے اعتبار سے پورے شعر کے مفہوم کا حامل ہے۔

نظیریؔ :- نظیریؔ از تو بجاں کندن است لب بکشائے — بایں قدر کہ بگوئی بمیر خرسند ست

نظیریؔ حالتِ نزع میں اپنے محبوب کی زبان سے یہ سننے کا آرزومند ہے کہ "بمیر" اگر محبوب اُس سے کہدے کہ مرجا تو مراد پوری ہوجائے۔ غالبؔ[1] نے شعر میں اپنی خودداری کا ثبوت دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ غالبؔ وہ نہیں کہ دنیائے وفا کا طالب ہو وہ دنیا کا احسان لینا نہیں چاہتے بلکہ وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر کوئی غالبؔ کا حال پوچھے اور جواب میں صرف یہ کہدیا جائے کہ وہ ہے، کافی ہے اور اس پر وہ خوش ہے۔
- -

نظیریؔ کے یہاں آرزومند کا قافیہ نہیں ہے۔ غالبؔ اور خانخاناںؔ کے یہاں یہ قافیہ ہے اور خوب ہے۔

خانخاناں :- شمارِ شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست — جزایں قدر کہ دلم سخت آرزومند ست

غالب :- زبیم آنکہ مبادا بمیرم از شادی — نگویدؔ، ارچہ بمرگ من آرزومند ست

مومنؔ خاں بھی آرزومند کے قافیہ میں کہتے ہیں :-

خوش است جور تواے چرخ لذتے بردم — بقہر نیز کہ نادیدہ آرزومند ست

پند کا قافیہ خانخاناںؔ اور نظیریؔ دونوں کے یہاں نہیں ہے غالبؔ کے یہاں البتہ ہے کہتے ہیں :-

غالب :- نگفتمہ کہ بتلخی بسازو پند پذیر، — بروکہ بادۂ ماتلخ تر ازیں پند ست

دوسرے مصرعہ کا بے ساختہ پن خوب ہے۔ لیکن مومنؔ کو جو پند سے تنفر ہے وہ بھی قابلِ ملاحظہ ہے۔

مومن :- چناں زحرفِ نصیحت گراں ملول شدم — کہ نشنوم زلب یار ہم اگر پند ست

اب کچھ وہ اشعار مومنؔ اور غالبؔ اور حافظؔ کے پیش کئے جاتے ہیں جو ہم طرح اور ہم قافیہ ہیں۔

حافظ :- ساقیا برخیزو در دہ جام را — خاک بر سر کن غمِ ایام را

غالب :- در دل تست انچہ برمن میرود — می شناسم سختیٔ ایام را

مومن :- از کفِ دشمن گرفتم جام را — می شناسم گردشِ ایام را

حافظ :- محرمِ رازِ دلِ شیدائے من، — کس نمی بینم زخاص و عام را

غالب :- رحمتِ عام است دائم خاص و عام — عشرتِ خاص است ہردم عام را

مومن :- بے کسی بنگر کہ بر تابوتِ من — چشم گریاں ست خاص و عام را

حافظ :- صبر کن حافظ بسختی استوار، — عاقبت روزے بیابی کام را

غالب :- بسکہ ایمانم بہ غیب است استوار — از دہانِ دوست خواہم کام را

لے غالب کا شعر ہے:-

مومن :- کام دلِ درویش ندیدیم در جہاں ، از جہاں رفتیم کہ جویم کام را

ایک دوسری غزل کے کچھ اشعار حافظ اور مومن کے ملاحظہ ہوں :-

حافظ :- آں چناں در ہوائے خاک درش — میرود آبِ دیدہ ام کہ مپرس

مومن :- بر جگر تیر خوردہ نخچیرم ، — نگہے از تو دیدہ ام کہ مپرس

حافظ :- گشتہ ام در جہان و آخر کار — دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس

مومن :- جائے ما نیز نیست از تنگی ، — خلوتے برگزیدہ ام کہ مپرس

حافظ :- من بگوشِ خود از دہانش دوش — سخنہائے شنیدہ ام کہ مپرس

مومن :- من بگویت نبودم و از غیر ، — ماجرائے شنیدہ ام کہ مپرس

حافظ :- ہمچو حافظ غریب در رہِ عشق — بمقامے رسیدہ ام کہ مپرس

مومن :- بے تو از حالِ من چہ می پرسی — ہاں بجائے رسیدہ ام کہ مپرس

جوہر ٹونکی

ایک دل کے دو آدمی

کلیفورنیا یونیورسٹی کے سائنس داں اس بات میں کامیاب ہو گئے کہ دو مختلف آدمیوں کے دلوں کو ایک ہی شریان سے وابستہ کر دیں اور اس طرح ایک ہی دل سے دونوں میں دوران خون کا کام لیا جائے اس طریقہ کو وہ Cross Circulation (متقاطع دوران خون) کہتے ہیں۔

ہر چند یہ تجربہ ابھی ابتدائی دور میں ہے لیکن توقع کی جاتی ہے کہ اگر اس میں خاطر خواہ کامیابی ہو گئی تو وہ بعض ناقابل علاج امراض کا علاج کر سکیں گے۔

دو آدمیوں کے شریانوں کو آپس میں جوڑ دینے سے دورانِ خون کا نظام دونوں جسموں میں ایک ہو جاتا ہے اور اس طرح یہ بات ممکن ہو گئی ہے کہ کسی قلب، پھیپھڑے، یا گردہ کے مریض کی شریان تندرست آدمی کے شریان میں جوڑ دی جائے اور اس طرح تندرست انسان کا خون مریض انسان کے جسم میں بھی پہونچتا رہے۔

یہ خیال سیام کے ان دو توام بچوں کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا جن کے دل باہم گر ایک ہی شریان سے کام کر رہے تھے۔

زہریلی عورتیں

شعر و شاعری اور حسن و عشق کی دنیا میں تو کوئی عورت ایسی نہیں جو زہریلی نہ ہو لیکن یوں حقیقی معنی میں کسی عورت کو زہریلی کہنا شاید مبالغہ سمجھا جائے۔ میرا موضوع سخن اس وقت عشق و شاعری سے بالکل علٰحدہ ہے اس لئے میں جن زہریلی عورتوں کا ذکر کر رہا ہوں وہ تکلف برطرف واقعی زہریلی تھیں اور انسان کو بالکل اُسی طرح ہلاک کر سکتی تھیں جس طرح ایک افعی اپنی پھنکار سے کسی کو ہلاک کر سکتا ہے۔

دنیا میں دشمن کو زہر دیکر ہلاک کرنے کا رواج کب سے شروع ہوا اور اس غرض کے لئے اس نے کیسے کیسے زہر ایجاد کئے اس کا صحیح علم ہم کو حاصل نہیں لیکن روایات سے ہم کو اس کا پتہ ضرور چلتا ہے کہ زہر خورانی کے دوسرے معمولی طریقوں کے علاوہ ایک نہایت عجیب و غریب ذریعہ اور بھی ہندوستان میں ایجاد کیا گیا، جسے "وش کنیا" (زہریلی عورت) کہتے تھے اور آج کی صحبت میں ہم بعض انھیں زہریلی عورتوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱)

جب ۳۲۷ء قبل مسیح، سکندر نے پنجاب پر حملہ کیا تو یہاں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم تھیں۔ ہرچند وہاں کے راجہ اکثر و بیشتر بہت کمزور تھے اور وہ سکندر کے سامنے تابِ مقاومت نہ لا سکتے تھے، لیکن ان کی غیرت گوارا نہ کرتی تھی کہ وہ اپنے ملک میں کسی اجنبی کا درخور گوارا کریں، چنانچہ انھوں نے سکندر کا خطرہ دور کرنے کے لئے جہاں اور بہت سی تدابیر اختیار کیں، ان میں ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ سکندر کو زہر سے ہلاک کر دیا جائے۔ اس کی صورت انھوں نے یہ تجویز کی کہ اظہار اطاعت میں سکندر کو جواہر اور بہت سے قیمتی تحفے روانہ کئے تو انھیں کے ساتھ پانچ خوبصورت لڑکیاں بھی پیش کیں ان میں خصوصیت کے ساتھ ایک لڑکی بہت حسین تھی۔ یہ سکندر کے دربار میں اس شان کے ساتھ پہونچی کہ بربط اس کے ہاتھ میں تھا اور ہندوستان کے دلکش ترین نغمے اس کی زبان پر۔ سکندر اسے دیکھ کر از خود رفتہ ہو گیا اور آغوش میں لینے کی خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ ارسطو (سکندر کا استاد) بھی دربار میں موجود تھا اور وہ محفل کا یہ رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس نے سکندر کی اس خواہش کی مخالفت کی اور سکندر سے کہا "ذرا ٹھہرو" اور یہ کہکر اُس نے دو غلاموں کو حکم دیا کہ وہ بڑھ کر اس لڑکی کا منھ چوم لیں، چنانچہ غلام آگے بڑھے، لیکن جیسے ہی اس کے ہونٹ لڑکی کے ہونٹ سے ملے، وہ معاً زمین پر گر کر مر گئے۔ اس کے بعد کچھ گھوڑے اور کتّے اُس خوبصورت بلا کے سامنے لائے گئے اور اس سے کہا گیا کہ ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے اور اس کا نتیجہ بھی یہی ہوا کہ گھوڑے اور کتّے فوراً مر گئے۔

سکندر یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا، اور اس نے ارسطو سے پوچھا کہ "یہ کیا ماجرا ہے"۔ ارسطو نے کہا کہ یہ لڑکی جس کو تم اپنی آغوش میں لینا چاہتے تھے ان لڑکیوں میں سے ہے جنھیں بچپن سے زہر کھلا کھلا کر پالا جاتا ہے اور آخر میں وہ مجسم زہر ہو کر رہ جاتی ہیں، اگر مجھے ہندوستانی راجاؤں اور حکیموں کی ان ترکیبوں کا علم نہ ہوتا تو اس نے یقیناً تجھے مار ڈالا ہوتا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ارسطو اپنے وطن یونان واپس چلا گیا لیکن وہ پھر بھی خطوں کے ذریعہ سے سکندر کو ہدایت

کرتا رہا کہ وہ ان زہریلی لڑکیوں سے ہوشیار رہے اور کبھی کسی ایک حکیم کی دوا استعمال نہ کرے بلکہ متعدد حکیموں سے مشورہ کرے

سکندر اور ارسطو کی یہ مراسلت پرانے زمانہ میں بہت مشہور تھی۔ اور خلیفہ المامون نے (تقریباً ۸۳۰ء میں) ایک سریانی عالم یحیٰی ابن بطریق کے ذریعہ سے اس کا پتہ چلاکر ان خطوں کا ترجمہ (جو غالباً یونانی زبان میں تھے) عربی میں کرایا۔ عربی ترجمہ کا نام "سرالاسرار" ہے جس کے مقدمہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ نادر خطوط معبد شمس میں دستیاب ہوئے جو اسقلاپیوس[1] سے منسوب تھا۔

سکندر اور ارسطو کے ان خطوط کا ترجمہ سریانی اور عربی کے علاوہ عبرانی، لاطینی (
)
ہسپانوی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی موجود ہے لیکن ان ترجموں میں کافی اختلاف ہے اور بعض محققین ان خطوط کو ارسطو سے منسوب نہیں کرتے۔ کیونکہ قرون وسطیٰ میں بہت سے لوگوں نے ارسطو کے نام سے فرضی کتابیں لکھیں تھیں، بہرحال یہ خطوط ارسطو کے ہوں یا کسی اور کے، ان میں ان زہریلی عورتوں کا ذکر پایا جاتا ہے۔

(۲)

سکندر کے حملے سے کچھ زمانہ قبل مگدھ میں ایک طاقتور راجہ مہاپدم نند راج کرتا تھا۔ اُس نے کسی بات پر ناراض ہوکر اپنے سپہ سالار چندر گپت موریا کو (جو موریہ خاندان کے چھتری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا[2]) جلاوطن کردیا۔ اس کے بعد اُس نے ایک برہمن کو جو بعض مذہبی رسوم کی ادائی کے سلسلہ میں لایا گیا تھا، محض اس لئے باہر نکلوا دیا کہ وہ سیاہ فام اور بدصورت تھا۔

اس برہمن کا نام چانکیا تھا (اُسے کوٹلیا اور وشنو گپت کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے) وہ ٹکشلا کی یونیورسٹی میں سیاسیات کا صدر معلم تھا اور اُس کی کتاب "کوٹلیہ ارتھ شاستر" بہت مشہور ہے۔

چانکیا کو یہ توہین بڑی شاق گزری اور اُس نے مجمع عام میں اپنی چوٹی کھول کر عہد کیا کہ جب تک اس راج کو بیخ و بن سے نہ اُکھاڑ پھینکوں گا اپنی چوٹی میں گرہ نہ لگاؤں گا اور یہ کہکر وہ دربار سے نکل گیا۔

ایک دن وہ کہیں جارہا تھا کہ اُس کے پاؤں میں خس کے پودھے کا ایک تنکا چبھ گیا۔ اس پر اُسے اس قدر غصہ آیا کہ وہیں بیٹھ کر اُسے کھودنے لگا اور پھر کہیں سے مٹھا لاکر اُس کی جڑوں میں ڈالا تاکہ وہ دوبارہ نہ اُگے۔ اتفاق سے اسی وقت چندر گپت کا ادہر سے گزر ہوا۔ اُس نے چانکیا کے اس کا جذبۂ انتقام اور اس کی مستقل مزاجی دیکھ کر اس سے دوستی کرلی اور چونکہ دونوں کا مقصد نند خاندان کو ختم کردینا تھا اس لئے یہ دوستی بہت زیادہ گہری ہوگئی۔

جب سکندر نے پنجاب پر حملہ کیا تو چندر گپت اُس سے جاکر ملا اور اُسے مگدھ پر حملہ کرنے کی ترغیب دی لیکن سکندر کی فوجیں تھکی ہوئی تھیں، اُنھوں نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا۔

سکندر کی وفات کے بعد جب پنجاب میں یونانی حکومت کی گرفت ڈھیلی پڑگئی تو چندر گپت نے اس موقعہ سے فایدہ اُٹھاکر یونانیوں کو ملک سے نکال باہر کیا اور پنجاب میں اپنی حکومت قایم کرلی۔ اس کے بعد اُس نے اپنے ساتھ ہمالیہ کے راجہ پروتک کو ملاکر مگدھ پر حملہ کیا اور راجہ نند مارا گیا یہ ۳۲۱ سال قبل مسیح کا واقعہ ہے۔

جب چندر گپت اور پروتک راجہ نند کے خزانے میں دولت کو اپنے درمیان تقسیم کررہے تھے تو اُنھیں ایک خوبصورت

---

[1] قدیم یونانیوں میں طب کا دیوتا — [2] بعض کا خیال ہے کہ وہ مگدھ کے راجہ نند کی ایک معمولی ذات کی داشتہ عورت مُرا کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ اسی لئے موریا کے لقب سے مشہور ہوگیا۔

دوشیزہ نظر آئی - پروتک اُسے دیکھتے ہی عاشق ہوگیا اور چندر گپت کی اجازت سے دونوں کی شادی طے ہوگئی - جب پروتک اُس خوبصورت دوشیزہ کے ساتھ شادی کی رسوم کے سلسلہ میں (ہَوَن کُنڈ) کا طواف کر رہا تھا تو دونوں کو پسینہ آگیا لیکن جونہی اس دوشیزہ کے جسم کا پسینہ پروتک کے جسم سے لگا وہ زمین پر گر پڑا اور مرگیا - یہ عورت بھی در اصل "وش کنیا" تھی جس کے ذریعہ سے وہ چندر گپت کو ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی خوش اقبالی سے بچ گیا اور پروتک کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

ان واقعات کا دشاکھ دت نے اپنے ناٹک "مدرا راکشش" میں ذکر کیا ہے جو ساتویں صدی کی تالیف ہے[1]۔

(۳)

دشاکھ دت کے مدرا راکشش کے علاوہ سوم دیو کے "کتھا سرت ساگر" (زمانۂ تالیف تقریباً ۱۰۷۰ء) میں بھی "وش کنیا" کا ذکر پایا جاتا ہے - اُس میں راجہ برہمادت کے وزیر یوگ کرنڈک کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ "اُس نے راستہ کے کنارے، درختوں بیلوں، سبزہ اور پانی کو زہر اور دوسری مضر اشیاء سے سم آلود کرنے کے علاوہ وش کنیاؤں کو بھی دشمن کی فوج میں بھیجا تھا۔

وش کنیا کس طرح طیار کی جاتی تھی - ارسطو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ جس لڑکی کو وش کنیا بنانا مقصود ہوتا تھا اُسے بچپن سے تھوڑا تھوڑا زہر کھلایا جاتا تھا - یہاں تک کہ جب وہ سنِ بلوغ کو پہونچتی تو وہ سر سے پاؤں تک زہر ہی زہر ہوتی تھی۔

قزوینی کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے - وہ لکھتا ہے کہ "ہندوستان کے عجائبات میں ایک سردھا البیس ہے جو بڑا قاتل زہر ہے - یہاں کے فرمانرواؤں کے یہاں دستور ہے کہ وہ کسی خوبصورت نوزائیدہ بچی کے گہوارہ کے نیچے اس پودے کی پتیوں کو عرصے کے لئے بچھا دیتے ہیں - پھر گدّے کے نیچے اور اُس کے کپڑوں کے نیچے - اُس کے بعد پودے کو دودھ میں ملاکر پلایا جاتا ہے - یہاں تک کہ وہ لڑکی اُسے بے خطر کھانے لگتی ہے - اس لڑکی کو وہ دیگر تحائف کے ساتھ اُس بادشاہ کے پاس بھیجتے ہیں جسے وہ ہلاک کرنا چاہتے ہیں اور جب وہ اُس لڑکی سے مواصلت کرتا ہے تو مرجاتا ہے۔

اگر ایک آدمی تھوڑا تھوڑا کرکے زہر کھانا شروع کرے اور اُس کی مقدار بڑھاتا جائے تو اُسکے جسم میں کس قدر سمیّت پیدا ہوجائے گی اس پر محمود شاہ والی گجرات (زمانہ تقریباً ۱۵۰۰ء) کے حالات سے روشنی پڑتی ہے اُس کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کے والد نے اُسے بچپن سے تھوڑا تھوڑا زہر کھلانا شروع کیا تاکہ اگر اُسے کوئی زہر دے تو اثر نہ ہو یہاں تک کہ جب وہ جوان ہوا تو اس میں اس قدر سمیّت پیدا ہوگئی تھی کہ اُس کے جسم پر مکھی بھی بیٹھتی تو فوراً مرجاتی، اُس کے اُتارے ہوئے کپڑوں کو کوئی شخص خوف سے ہاتھ نہ لگاتا، ہر وہ عورت جس کے ساتھ وہ شب بسر کرتا صبح کو مردہ پائی جاتی۔

ان واقعات کو متعدد مغربی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں لکھا ہے۔ (جن میں وارتھیما اور باربوسا کے نام قابلِ ذکر ہیں) - زہر کو نشہ یا طاقت کے لئے کھانا کوئی عجیب بات نہیں آج بھی ہندوستان کے بہت سے لوگ زہر کھاتے ہیں - یہ زہر تین صورتوں میں حاصل کئے جاتے ہیں - جمادات سے جیسے سنکھیا[1] (سم الفار) نباتات سے جیسے افیون اور دھتورا[2] اور حیوانات سے جیسے بچھو کا ڈنک اور سانپ کا زہر[3] زہر، زہر کا توڑ ہے جو لوگ افیون کھاتے ہیں اُن پر سانپ کے کاٹے کا اثر نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا زہر کے مسلسل استعمال سے انسان کے جسم میں اس قدر سمیّت پیدا ہوجائے گی، اُس کی سانس، اُس کا پسینہ، اُس کا لعابِ دہن وغیرہ سب سم قاتل بن جائیں، اس کی بابت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن متذکرۂ بالا روایات سے ضرور اسکی تصدیق ہوتی ہے - **محمد اسحٰق صدیقی**

---

[1] پہلے کسی پتھر پر سنکھیا سے ایک چھوٹی لکیر کھینچتے ہیں جسے زبان سے چاٹتے ہیں یا پانی سے دھوکر پیتے ہیں - یہ چھوٹی لکیر دن بدن بڑھائی جاتی ہے پھر اسکے بعد دوسری اور تیسری اور چوتھی لکیروں کی باری آتی ہے — [2] جو لوگ تیز بھنگ پینے کے عادی ہیں وہ اُس میں دھتورے کے بیج شامل کرلیتے ہیں۔

[3] بعض آدمیوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ بچھو کو پکڑ کر اُس کی دم اپنی زبان کی نوک کے مقابل لاتے ہیں اور جب وہ ڈنک مار دیتا ہے تو اُنھیں تسلی ہوجاتی ہے - اسی طرح بعض اپنے کو سانپ سے ڈسوا کر فرحت محسوس کرتے ہیں۔

کچھ داغ کے متعلق

جناب عرشی کا یہ مقالہ مارچ کے خاور میں شایع ہوا ہے، اگر عرشی صاحب یہ مقالہ داغ نمبر کی اشاعت سے قبل طیار کرسکتے تو وہ یقیناً نگار ہی میں شایع ہوتا، اس لئے ہم اسے نگار ہی کی ملکیت سمجھتے ہیں اور عرشی و خاور دونوں کے ممنون ہیں۔ اس مقالہ کے ابتدائی حصہ میں عرشی صاحب نے ایک فہرست تمام ان کتابوں اور تذکروں کی دیدی ہے جن سے داغ پر کام کرنے والوں کے لئے مدد لی جاسکتی ہے، اس حصہ کو حذف کرکے ہم اصل مضمون شایع کرتے ہیں، جس کی اہمیت کا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے۔

نیاز

خاندان داغ کے والد کا نام سب سے پہلے امیر مینائی نے اور والدہ کا نام فساخ نے بتایا ہے۔ والد نواب شمس الدین احمد خاں بہادر والیِ فیروز پور جھرکہ نواب احمد بخش بہادر کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کی تاریخ وفات ۸ر اکتوبر ۱۸۳۵ء – ۱۲۵۱ھ ہے انھیں ۲۵ سال کی عمر میں دہلی کے ریزیڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی۔

مولانا مہر نے غالب (صفحہ ۵۳) میں لکھا ہے کہ "شمس الدین احمد خاں کے نرینہ اولاد نہ تھی، صرف لڑکیاں تھیں جنکی شادیاں بعد میں ہوئیں"۔ یہ بیان اس حد تک تو درست ہے کہ ان کی بیاہتا بیوی سے کوئی لڑکا نہ تھا۔ لیکن یہ صحیح نہیں کہ ان کے نرینہ اولاد سرے سے موجود ہی نہ تھی۔ داغ کا شمس الدین خاں کے نطفے سے ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ داغ کی نظر میں ان کے قانونی اولاد ہونے کی حیثیت مشتبہ ہو، جس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ نواب کی ریاست کی ضبطی کے خلاف انکی بیاہتا بیگم نے بیٹیوں کی طرف سے چارہ جوئی کی۔ لیکن داغ کی والدہ کی طرف سے اس قسم کی کوئی سعی نظر نہیں آتی۔

داغ کی والدہ محمد یوسف سادہ کار کشمیری کی بیٹی تھی۔ مالک رام صاحب نے اس کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم بتایا ہے اور اسے اپنے باپ کی منجھلی بیٹی قرار دیا ہے۔ اسکے کشمیری الاصل ہونے کا ثبوت خود اس کی تحریر سے ملتا ہے، جو اس نے ۶ر رجب ۱۲۸۱ھ مطابق ۱۲ر دسمبر ۱۸۶۴ء کو نواب یوسف علی بہادر فردوس مکان والی رام پور کو مبارکباد صحت کے سلسلہ میں لکھی تھی۔ اس میں وہ لکھتی ہیں:-

"از خارج استغنا نمودہ کہ عزم ملازمان حضور در موسم بہار برائے سیر و تفریح حضرت کشمیر جنت نظیر کہ وطن اصلی بزرگانِ ماست، تقرر یافتہ"

لیکن اس کا منجھلی ہونا ثبوت طلب ہے۔ اس لئے کہ خود چھوٹی بیگم کی عرفیت کا تقاضہ یہ ہو کہ وہ اپنے باپ کی اولاد میں سب سے چھوٹی ہو۔

داغ کے سوانح نگاروں نے ان کی والدہ کو ولی عہد بہادر کی طرف سے مخاطب بہ "نواب شوکت محل صاحبہ" بتایا ہے۔ لیکن محولۂ بالا خط اور ایک اور خط کے آخر میں مہر ثبت ہے، جس میں "چھوٹی بیگم، ۱۲۴۲" منقوش ہے، خود چھوٹی بیگم نے نواب فردوس مکاں کو ۱۵ر اگست ۱۸۵۵ء کو جو عرضی بھیجی تھی اس کے آخر میں بھی اپنا نام چھوٹی بیگم ہی لکھا ہے، اس کے چند دن بعد ۲۰ محرم ۱۲۷۲ھ ۲ر اکتوبر ۱۸۵۵ء کو داغ کی خالہ عمدہ خانم نے عرضی بھیجی تو اس میں بھی یہی لکھا، چونکہ اس نے ولی عہد کی زندگی میں اپنا نام چھوٹی بیگم ہی لکھا اور انکے انتقال کے بعد وہ مہر استعمال کی جو داغ کے والد کی زندگی میں کھودی گئی تھی، اس سے ولی عہد کی طرف سے "شوکت محل" خطاب پانا محل نظر قرار پاتا ہے۔

چھوٹی بیگم کی صحیح تاریخ انتقال کا ابھی تک پتہ نہ چل سکا۔ لیکن نواب خلد آشیاں کا ایک فرمان مورخہ ۱۷ر شعبان ۱۲۹۶ھ

(۷ اگست ۱۸۸۹ء) محفوظ ہے جو داغ کی عرضی کے جواب میں لکھا گیا تھا - اس میں نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں :-

"عرضی ایشان مشعرِ حالِ انتقالِ والدۂ ایشان باستدعای مبلغ دوصد روپیہ بہ ضرورت مصارف بلاحظہ گزشت و بدریافت انتقال والدۂ ایشان نہایت رنج و افسوس گردید"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شعبان ۱۲۹۹ھ کی ابتدائی تاریخوں میں سے کسی ایک میں ان کا انتقال ہوا تھا -

نواب فردوس مکاں کے قیام دہلی کے زمانے سے چھوٹی بیگم کی بہن عمدہ خانم کو نواب صاحب سے توسل حاصل تھا اور اسی سلسلہ سے عمدہ خانم اور داغ اپنی ملازمت سے قبل رام پور آتے رہے تھے - لیکن خود چھوٹی بیگم کے آنے کا دستاویزی ثبوت نواب خلد آشیاں کے عہد میں ملتا ہے - داغ نواب صاحب کو دہلی سے یکم جولائی ۱۸۸۵ء کو لکھتے ہیں -

"جناب خالہ صاحبہ سے ملا انھوں نے حضور کی صحت کے واسطے گود پھیلاکر دعا مانگی - عجیب حال ان کا دیکھا کہ چراغِ سحری پایا - حضور کی طرف سے حسب ہدایت سلام کہا - بہت دعائیں دیں - کہا کہ چونکہ تمہاری والدہ وہاں گئی تھیں، مشرف ملازمت سے نہ ہوئیں اور اس صدمے میں مرگئیں - اس لحاظ سے میں اس حالتِ ضعف میں بھی گو ہزار بار قصد کیا، نہ حاضر ہوسکی" (انشائے داغ)

داغ کے علاوہ چھوٹی بیگم کے دو بیٹے اور ایک بیٹی اور تھی - چونکہ یہ سب الگ الگ باپوں سے تھے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی تاریخہائے ولادت کا ذکر کیا جائے - تاکہ اس سے چھوٹی بیگم کے مختلف ازدواجی تعلقات پر روشنی پڑسکے -

(۱) داغ کی تاریخ پیدائش ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء (۲۶ ذیحجہ ۱۲۴۶ھ) ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم ازکم آغاز ۱۲۴۶ھ سے چھوٹی بیگم نواب شمس الدین خاں کے گھر میں تھیں - اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ داغ اس کے پہلوٹی کے بیٹے تھے اور اس کی عمر ولادتِ داغ کے وقت ۱۶ برس کی تھی، تو اس کا سالِ ولادت تقریباً ۱۲۳۰ھ (۱۸۱۵ء) ہوگا -

(۲) چھوٹی بیگم کے دوسرے بیٹے آغا مرزا شاغل ہیں، جو آغا تراب علی کی صلب سے پیدا ہوئے تھے - امیر مینائی نے ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۲ء میں انھیں ۳۳ برس کا بتایا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاغل کا سال ولادت ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) ہے چونکہ شمس الدین خاں نے ۱۸۳۵ء (۱۲۵۲ھ) میں پھانسی پائی تھی - اس لئے چھوٹی بیگم کو آغا صاحب کے گھر میں اس سنہ کے بعد اور ۱۲۵۷ھ سے پہلے داخل ہونا چاہئے - مولانا احسن مارہروی مرحوم نے انشائے داغ (صفحہ ۱۱) میں شاغل کو سہواً داغ کا علاتی بھائی لکھ دیا ہے، یہ علاتی نہیں، اخیافی بھائی تھے -

(۳) چھوٹی بیگم کے تیسرے بیٹے مرزا خورشید عالم ہیں - جو ولی عہد مرزا فخرو کی صلب سے تھے - ان کا سال ولادت یقینی طور پر ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) ہے، اس لئے کہ ان کا نام تاریخی رکھا گیا تھا - اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۲۵۷ھ (۱۸۴۱ء) اور (۱۲۶۱ھ) کے درمیانی سال میں چھوٹی بیگم ولی عہد کے محل میں پہونچی تھی -

(۴) چھوٹی بیگم کی چوتھی اولاد بادشاہ بیگم خفی تخلص ہے، جو کسی بلاک نامی انگریز سے پیدا ہوئی تھی - اس کا سال ولادت

لہ صدیق مکرم مالک رام صاحب نے اپنے مضمون تلامذۂ غالب (اُردو ادب ج ۲ نمبر ۱ صفحہ ۹۹ حاشیہ نمبر ۱) میں انھیں خورشید عالم سے چھوٹا بتایا ہے یہ درست نہیں اس لئے کہ عمدہ خانم نے ۲۰ محرم ۱۲۷۲ھ (۱۲ اکتوبر ۱۸۵۵ء) کو جو عرضی نواب فردوس مکاں کی خدمت میں لکھی تھی، اس میں یہ بھی تحریر ہے کہ فدوی نیازمند نواب مرزا و امیر مرزا و آغا مرزا و خانم صاحبہ و چھوٹی بیگم بخدمت عالی ماوجب می رسانند" یہ عرضی ولی عہد کی زندگی میں لکھی گئی تھی - آغا تراب علی سے تعلق ولی عہد کے انتقال کے بعد ہوا ہوتا، تو آغا مرزا کو ابھی پیدا ہونے میں دیر تھی —— ۲ہ احتمال یہ بھی ہے کہ وہ داغ سے بڑی ہو، جیسا کہ صدیق مکرم مالک رام صاحب نے اپنے مضمون مذکورہ میں ذکر کیا ہے مگر اس میں مجھے یوں شبہ ہے کہ ۱۲۸۱ھ میں رنج نے اس کا ذکر ایک جوان اور خوبرو حسن فروش کے انداز سے کیا ہے اگر یہ ۱۲۴۶ھ (سال ولادت داغ) سے پہلے کی پیدائش ہوتی، تو ۱۲۸۱ھ میں اسکی عمر کم ازکم ۳۵ اور ۴۰ کے درمیان ہونا چاہئے تھی - جو اس جیسی عورت کے لئے حسن کے زوال کا زمانہ ہے -

معلوم نہیں - ریخ میرٹھی نے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) اس کو شعر گو کی حیثیت سے پیش کیا ہے - اس سے یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سنہ مذکورہ میں وہ جوان تھی - چھوٹی بیگم ۱۲۴۶ھ سے ۱۲۵۲ھ تک شمس الدین خاں سے، تقریباً ۱۲۵۶ھ سے ۱۲۵۷ھ تک آغا تراب علی سے اور ۱۲۶۰ھ سے ۱۲۷۰ھ تک ولی عہد سے وابستہ رہی تھی - اس سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ یا تو ۱۲۵۲ھ اور ۱۲۵۶ھ کے درمیان یا ۱۲۵۷ھ اور ۱۲۶۰ھ کے درمیان ان کا تعلق بلاک سے ہوا - جس کا نتیجہ بادشاہ بیگم تھی، لہٰذا اسے انھیں دو مدتوں میں سے کسی ایک میں پیدا ہونا چاہئے -

خفی اپنے مذکورۂ بالا تینوں بھائیوں کی طرح صاحب کمال اور شاعرہ تھی اس نے ۱۳۱۰ھ (۹۳-۱۸۹۲ء) میں اپنے نعتیہ کلام کا ایک مجموعہ طبع کرایا تھا - داغ نے اس کا قطعۂ تاریخ طباعت لکھا تھا جو اس کے دیوان میں چھپ چکا ہے اس کے یہ دو شعر قابل لحاظ ہیں :-

واہ عصمت مآب کیا کہنا　　کیا ہی اچھی کہی ہے نعت نبی

طبع دیوان کا سال تو اے داغ　　کہدے "مطبوع عشق پاک نبی"

داغ نے ۲۰ مئی ۱۹۰۴ء کو ایک خط حیدر آباد سے اولیا بیگم کے نام دہلی بھیجا تھا، اس سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بادشاہ بیگم جے پور میں تھی اور بیمار تھی - (انشائے داغ صفحہ ۷۴) لیکن سال وفات کا ابھی تک علم نہیں ہوا ہے -

میں نے عمدہ خانم کی ایک عرضی مورخہ ۲۰ محرم ۱۸۷۳ء کا اقتباس پچھلے ایک حاشیہ میں دیا ہے - اس میں نواب مرزا، امیر مرزا، اور آغا مرزا، تین نام آئے ہیں - ان میں سے دو، نواب مرزا داغ اور آغا مرزا شاغل کا ذکر چھوٹی بیگم کی اولاد کی حیثیت سے گزر چکا یہ تیسرا نام "امیر مرزا" قابلِ غور ہے - چونکہ یہ نام نواب مرزا اور آغا مرزا کے جوڑ کا ہے، اس سے مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ بھی داغ کے بھائیوں میں داخل ہے - اتفاق سے اس کی ایک عرضی مورخہ ۲۷ اگست ۱۸۶۸ء بنام نواب خلد آشیاں کتاب خانے میں دستیاب ہوئی - اس میں وہ لکھتا ہے :- "میلۂ باغ بے نظیر پر قصد حاضری کیا تھا - مگر بچند وجوہ معذور رہا - اول میرے توہمات مانعِ راہ ہوئے - دوئم بیماری برخوردار سے پریشانی رہی - ورنہ قدم بوسی حاصل کرتا --- ایک مہینہ گزرتا ہے جو بھائی صاحب یعنی نواب مرزا خاں داغ نے مطلق خط نہیں لکھا - کمال تشویش ہے واللہ عالم کیا بات ہے - امیدوار ہوں کہ پیشگاہِ حضور سے ان کو ارشاد ہو کہ انھوں نے مکاتیب میں اس درجہ تاخیر کیوں کی ہے - عرضی محمد امیر مرزا دہلوی"

اس خط میں داغ کو بھائی صاحب لکھنا اور ان کی خیرت جوئی کا بے حد مشتاق ہونا اس کی دلیل ہے کہ وہ داغ کا بھائی تھا - رہا یہ امر کہ وہ داغ کا ماں جایا تھا یا خالہ زاد، اس کا فیصلہ بحالاتِ موجودہ دشوار ہے - داغ کے خط بنام عزیز بیگم مورخہ ۵ اکتوبر ۱۸۹۳ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں امیر مرزا جے پور میں تھا - اور آج کل میں حیدر آباد جانے والا تھا - اس کے بعد ۲۲ جنوری ۱۸۹۴ء کو داغ نے بیخود دہلوی کو لکھا تھا کہ "بھائی امیر مرزا صاحب جے پور واپس آگئے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قیام جے پور ہی میں رہتا تھا -

انشائے داغ میں مسماۃ عزیز بیگم اور اولیا بیگم دو عورتوں کے نام بھی خط نظر آتے ہیں - انھیں داغ نے ہمشیرہ اور بہن کے القاب سے یاد کیا ہے، مولانا احسن مارہروی نے ان کے رشتے پر روشنی نہیں ڈالی - خدا جانے یہ کس رشتے کی بہنیں تھیں - اب خاندان لوہارو کے کسی معمر فرد سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان کے تعلق کی حقیقت کو بیان کریں گے -

آمد رام پور

سرکار رام پور کی باضابطہ ملازمت سے پہلے بھی داغ رام پور آتے رہتے تھے، اب تک مجھے حسب ذیل تاریخی حوالے مل سکے ہیں (۱) داغ کی خالہ عمدہ خانم اور نواب فردوس مکاں کے درمیان موخر الذکر کے قیام دہلی کے زمانہ سے رابطۂ محبت و وداد تھا - تخت نشینی کے بعد عمدہ خانم نے نہایت پر اشتیاق عرضیاں لکھیں - آخری عرضی کے جواب میں ۱۲ شوال ۱۲۷۱ھ (۲۹ جون ۱۸۵۵ء) کو نواب صاحب نے جو خط لکھا تھا اس کے آخر میں بھی یہ تحریر تھا :-

"المختصر عبارت آرائی تا کجا - حسب الطلب آں مطلوب دہا ہشت نفر کہاران و پالکی دیک منزل رتھ دیک پہرۂ تلنگان دو کس

ہرکارہ می رسد۔ حرکت را برسکون راجح شمارند و مارا مشتاق دیدار خود انگارند۔"

چھوٹی بیگم نے ۵ ر اگست ۱۸۵۵ء (ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ) کو ایک عرضی نواب فردوس مکاں کی خدمت میں بھیجی تھی۔ اسمیں وہ لکھتی ہے

"از تحریر دوحۂ حدیقۂ تمنا برخوردار نواب مرزا گلبانگ نوید صحت وری مزاج عالی دریافتہ نوازشات خاوندانہ و تفقدات فدویانہ کہ بر حال برخوردار مذکور مرعی و مبذول فرمودند، اگر در جنب شکر و سپاس مثل صد برگ از ہر بن مو ہزار زبان بر آرم، ادای عشر عشیر نمی تواں کرد۔

فی الواقع از دیر باز آن نور الابصار آرزوی قدم بوسی جناب باقصی الغایات در دل عقیدت منزل خود متمکن داشت۔ فرط تمنائی تلثیم عتبۂ سپہر تکریم بغیر اجازت ولی عہد بہادر خود را بدرِ دولت حاضر ساختہ بشرف باریابی ملازمت کیمیا خاصیت مفخر و مباہی گشت۔ الحمد للہ کہ آخر الامر بمنتہائے مرام دل خود رسید۔ و تفقدات گوناگوں و عنایات بوقلموں برای العین معائنہ گردید

رقیمۂ نیاز چھوٹی بیگم"

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ داغ ذیقعدہ ۱۲۷۱ھ میں رام پور آئے ہوئے تھے۔

عمدہ خانم ۲۰ ر محرم ۱۲۷۲ھ کو رام پور سے واپس دہلی پہونچی تھی۔ اور اس نے اسی دن ایک عرضی نواب صاحب کو لکھی تھی جس کا اقتباس ابھی گزر چکا ہے۔ عمدہ خانم کے اس خط میں داغ کا سلام تحریر کیا ہے اس لئے اس خط اور چھوٹی بیگم کے خط ان دونوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ داغ کا رام پور میں ورود شوال ۱۲۷۱ھ کے آخر میں اپنی خالہ کے ساتھ ہوا تھا اور انھیں کے ساتھ ۲۰ ر محرم ۱۲۷۲ھ کو وہ دہلی واپس پہونچ گئے۔

(۲) دسمبر ۱۸۵۵ء سے اگست ۱۸۵۶ء تک داغ دہلی میں تھے۔ کیونکہ عمدہ خانم کے اس زمانہ کے خطوط انھیں کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں اور ان سب خطوں میں انھوں نے مکتوب الیہ کو اپنا سلام بھی پہونچایا ہے۔

(۳) ۱۲ ر شعبان ۱۲۷۵ھ (۲۷ ر مارچ ۱۸۵۹ء) کے غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ اس تاریخ سے قبل رامپور آکر دہلی واپس جا چکے تھے[1]

(۴) ۱۷ ر مارچ ۱۸۶۰ء اور ۲ ر نومبر ۱۸۶۰ء کو داغ نے دہلی سے نواب فردوس مکان کے حضور میں عرضیاں ارسال کی تھیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نومبر ۱۸۶۰ء تک دہلی ہی میں تھے[2]

(۵) ۱۳ ر اگست ۱۸۶۵ء کو غالب کی عرضی بنام خلد آشیاں سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ رام پور آئے ہوئے ہیں۔[3]

(۶) ۸ ر فروری ۱۸۶۶ء کے داغ کے ایک خط بنام ۔۔۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نواب خلد آشیاں کی تخت نشینی کے جشن میں شریک ہو کر اس تاریخ سے قبل دہلی واپس جا چکے تھے[4]

(۷) ۳ ر اور ۴ ر مارچ ۱۸۶۶ء کو داغ نے دو عرضیاں دہلی سے بھیجی تھیں، ان کا جواب نواب خلد آشیاں کی طرف سے ۱۳ ر مارچ (۲۵ ر شوال ۱۲۸۲ھ) کو روانہ کیا گیا۔ اس میں نواب صاحب نے یہ بھی لکھا ہے۔

"چوں حاضر شدن آں عوالی مرتبت در حضور مناسب متصور، لہذا قلمی می رود کہ حاضر حضور شوند، و مزاج حضور را متوجہ حال صداقت اشتمال خود دانند۔

(۸) ۲۹ ر مارچ سنہ مذکور کے غالب کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ داغ نے رامپور آنے کی طیاری شروع کر دی ہے[5]

(۹) ۱۸ ر اپریل ۶۶ء کو داغ نے دہلی سے ایک خط منشی سیل چند کے نام لکھا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ اس تاریخ تک رام پور نہیں آئے تھے۔

---

[1] حکایت غالب ص۱۱ - طبع چہارم - [2] انشائے داغ - [3] حکایت غالب ص۱۹ - [4] انشائے داغ ص۸ [5] مکاتیب غالب - صفحہ ۱۰۱

اخبار الصنادید (ج ۲ صفحہ ۲۰۸) کا بیان ہے کہ ۱۴ر اپریل سنہ ۶۶ء کو داغ کا تقرر ہوا تھا۔ اس کا ظاہری اقتضا یہ ہے کہ وہ اس تاریخ سے قبل رام پور آچکے تھے، جو داغ کے ۱۸ر اپریل کے خط کے منافی ہے۔ اس صورت میں یا تو داغ کے خط کی تاریخ غلط ہے اور یا اخبار الصنادید میں ۲۴ کی جگہ ۱۴ درج ہوگیا ہے۔ خزانے کی امسلہ سنہ ۱۹۴۷ء میں جل چکی ہیں۔ اس لئے مزید تحقیق ممکن نہیں۔

بہر حال داغ کا مستقل قیام رام پور اپریل ۱۸۶۶ء سے شروع ہوکر سنہ ۱۸۸۷ء تک رہا ہے۔

تصانیف

داغ کی حسب ذیل تصانیف ہم تک پہونچی ہیں۔

(۱) گلزار داغ، جو ان کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ سب سے پہلے مطبع تاج المطابع رام پور میں سنہ ۱۲۹۶ھ (سنہ ۱۸۷۹ء) میں چھپا تھا۔ کتاب خانہ رام پور میں یہ ایڈیشن موجود ہے۔

(۲) آفتاب داغ، جو ان کے کلام کا دوسرا مجموعہ ہے۔ یہ پہلی بار سنہ ۱۳۰۲ھ میں منشی تیغ بہادر کے مطبع انوار الاخبار لکھنؤ میں چھپ کر شایع ہوا تھا۔ حمیدن بائی نقاب کو داغ نے ایک خط ۵ ستمبر سنہ ۱۸۸۵ء کو لکھا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل ایک نسخہ نواب خلد آشیاں کے پاس پہونچ چکا تھا، جس کا یہ مطلب ہے کہ ۲۵ ذی قعدہ سنہ ۱۳۰۲ھ سے پہلے طباعت مکمل ہوچکی تھی۔

کتاب خانہ رامپور میں اس مطبع کا سنہ ۱۳۰۶ھ کا مطبوعہ نسخہ موجود ہے۔

(۳) مہتاب داغ، جو ان کے کلام کا تیسرا مجموعہ ہے۔ یہ ۳ر جمادی الآخر سنہ ۱۳۱۰ھ (سنہ ۱۸۹۲ء) کو مطبع عزیز دکن حیدر آباد میں چھپا تھا۔

(۴) یادگار داغ، جو ان کے کلام کا چوتھا مجموعہ ہے۔ یہ داغ کے انتقال کے بعد سنہ ۱۳۲۳ھ (سنہ ۱۹۰۵ء) میں اسٹیم پریس لاہور میں چھپا تھا۔

(۵) ضمیمۂ یادگار داغ، جو دیوان چہارم کا تتمہ ہے۔ اس کا کوئی نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں محفوظ نہیں۔

(۶) فریاد داغ۔ یہ ان کی مثنوی ہے جس میں منی بائی حجاب سے اپنے معاشقے کا ذکر کیا ہے۔ جلال لکھنوی نے (دیوان جلال موسوم بہ شاہد سخن صـ۴۵) فریاد داغ سے اس کا سال نظم نکالا ہے جو سنہ ۱۳۰۰ھ (۸۲ - ۸۳ ۱۸ء) ہے اور فیروز رام پوری نے "نظم دردمندی" سے اس کا سال طباعت برآمد کیا ہے جو سنہ ۱۳۰۲ھ ہے۔

کتاب خانۂ رام پور میں اس کا تیسرا ایڈیشن محفوظ ہے، جو ۲۵ر مئی سنہ ۱۸۹۵ء (سنہ ۱۳۱۲ھ) کو سید ابن علی منیجر کے اہتمام سے مطبع مطلع العلوم و اخبار نیر اعظم مراد آباد میں سید میر حسن صاحب مالک اخبار خیر خواہ عالم دہلی کی فرمایش پر ۲ ہزار کی تعداد میں چھپی تھی و ۸ر فی نسخہ فروخت ہوئی تھی۔ ان تصانیف کے علاوہ داغ کے دواوین کے تین انتخاب بھی چھپے ہیں۔

(۱) پہلا انتخاب بنام "انتخاب داغ" مطبع انور محمدی لکھنؤ سے شایع ہوا تھا۔ یہ گلزار داغ، آفتاب داغ اور مہتاب داغ کا انتخاب ہے

(۲) دوسرا انتخاب "کمال داغ" کے نام سے مخدومی مولانا حامد حسن قادری صاحب نے کیا ہے، اور آگرہ اخبار پریس آگرہ میں چھپا۔ یہ کل کلام کا انتخاب ہے۔

(۳) تیسرا انتخاب مولانا احسن مارہروی مرحوم نے "منتخب داغ" کے نام سے کیا تھا، جو ان کی وفات کے بعد انوار احمدی پریس الہ آباد سے چھپ کر شایع ہوا۔ یہ بھی کل کلام کا انتخاب ہے۔

غالب کی رائے کلام داغ پر

محمد نثار علی شہرت نے آئینۂ داغ (صـ۴۴) میں لکھا ہے:۔

ایک روز میں مرزا غالب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اس وقت آپ کھانا نوش فرما رہے تھے، میں مودب ہوکر ایک طرف بیٹھ گیا۔ آپ نے ایک رنگ ترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے۔ چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا، میں نے اس رنگ ترہ کو ہاتھ نہیں لگایا۔ آپ تاڑ گئے اور فرماتے کیا ہیں "ہاں آپ مولوی ہوگئے ہیں" میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے۔ جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا، اس میں کچھ بنانے لگے غالباً اصلاح دے رہے تھے۔ میں نے گزارش کی "جناب کیا ارقام فرما رہے ہیں" تو فرمانے لگے۔ "اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دئے گئے ہیں اس لئے انھیں نکال رہا ہوں

اور شستہ اُردو الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں" میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی "آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے" فرمانے لگے وہ جوانی کی نازک خیالیاں ہیں۔ شہرت بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی خود نہیں بیان کر سکتا" پھر فرمانے لگے "دہلی والوں کی جو اُردو ہے (جس کو مشک وعنبر کہنا چاہئے) اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہئے۔ آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قایم ہوئی ہے" میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ "داغ کی اُردو کیسی ہے؟" فرمانے لگے "ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی، ذوق نے اُردو کو اپنی گود میں پالا تھا، داغ اس کو نہ فقط پال رہا ہے۔ بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میرزا غالب بھی ان کی زبان کی صفائی اور محاورات کی درستگی و برجستگی کے معترف تھے۔

اصلاحیں

داغ نے اپنے اور دوسروں کے کلام میں جو اصلاحیں کی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے وہ بہت سلیم طبع کے مالک تھے اور عموماً مناسب اور پسندیدہ دخل کیا کرتے تھے۔

فیروز رامپوری لکھتے ہیں کہ ایک روز صاحبِ عالم مرزا رحیم الدین صاحب حیاؔ اُستاد کے یہاں تشریف لائے۔ اس وقت استاد زنانے مکان میں تھے۔ میں مرزا صاحب سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا۔ انھوں نے اپنا مطلع فخریہ پڑھا اور کہا ایسا مطلع کوئی کہدے تو جانوں ؎

سینے میں اس کے تیر کا پیکاں کہیں نہیں   بس اب ہمارے پاؤں کے نیچے زمیں نہیں

تھوڑے عرصہ میں استاد بھی باہر آئے۔ مرزا صاحب تو اُن سے کچھ بات چیت کر کے رخصت ہوگئے۔ میں نے وہ مطلع اُستاد کو سنایا استاد نے فرمایا کہ یہاں پہلا مصرع یوں ہوتا تو خوب تھا ؎ "پیکانِ یار سینے میں اپنے کہیں نہیں" اہلِ کمال اس نکتہ کو سمجھیں گے۔

؎ ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

اپنے کلام پر اصلاح کے لئے انشائے داغ صفحہ چہارم ملاحظہ کیجئے جہاں وہ غزل درج ہے، جو انھوں نے ۲۹ برس کی عمر میں لکھ کر رام پور بھیجی تھی۔

شاگردوں کے کلام پر اصلاحوں کے لئے مولانا سیماب مرحوم کی کتاب دستور الاصلاح صفحہ ۹، ملاحظہ کیجئے۔ فیروز رام پوری نے حسب ذیل اصلاحیں نقل کی ہیں:-

(۱) سید عنایت احمد صاحب متخلص بہ حیرت ساکن بدایوں محلہ سید باڑہ نے ایک خط بدیں مضمون بھیجا کہ "طرح مشاعرہ میں جو میں نے غزل لکھی ہے، لکھنوی اس کو از مطلع تا مقطع مہمل بتاتے ہیں۔ لہذا آپ کی خدمت میں روانہ کرتا ہوں اور منصفانہ رائے چاہتا ہوں کہ اس کے عیوب سے مطلع کیا جاؤں"۔

ان کی غزل کے سولہ شعر تھے۔ مرزا داغ نے ان شعروں پر اپنی رائے لکھی۔

سامانِ جنوں کیا کوئی دشوار نہیں ہے   اب ہات ہیں، تو جیب میں اک تار نہیں ہے

"اب" کا لفظ بگاڑتا ہے۔

عاشق ترے ظلموں کو سمجھتے ہیں کرم، ہائے   آزار ہے، تو لذتِ آزار نہیں ہے

"عاشق ترے ظلموں" اس کا لطف میں نہیں سمجھا۔

شرماتے ہو کیوں، دیکھ کے مستانہ ادائیں   یہ آنکھ ہے، کچھ ساغرِ سرشار نہیں ہے

اس شعر میں کس کی اداؤں کا ذکر ہے۔ عاشق کی ادائیں دیکھ کر معشوق شرماتا ہے یا اپنی اداؤں سے شرماتا ہے۔ اگر اپنی ادائیں دیکھ کر شرماتا ہے، تو "اپنی" کا لفظ چاہئے یا "آئینہ" کا لفظ چاہئے، مگر یہ (ثابت) ہوچکا کہ عاشق کی مستانہ ادائیں دیکھ کر شرماتا ہے یہ "دیکھ" اسی پر دال ہے۔

(۳) نادر حسین صاحب نادر اور حمید اللہ صاحب عاجز نے اصلاح کے لئے اپنا کلام بھیجا تھا - اس پر لکھا -

"لفظ تب" متروک ہے - آپ کا یہ مصرع ہے :- "آزماتا آپ کو ہے خاص جب اک کام میں" اور میرا یہ مصرع ہے :-
"غیر کو کیوں چھوڑتے ہو قتل گاہِ عام میں" بس غور کرنا چاہئے اس امر کو کہ "آپ" کا صلہ "چھوڑتے ہو" نہیں آنے کا - یہ ربط نہیں کھانے کا - لفظ "ہو" تم کا صلہ ہوسکتا ہے "آپ" کا صلہ "ہیں" چاہیے بادہ پیمائی کی (ی) گرتی ہے - میں فارسی کے یں گرتا ہوا حرف نہیں رکھتا ہوں - "چال و انداز" کا عطف جایز نہیں ہے وہ ہندی ہے یا فارسی ہے "الہی نہ اس کے سوا چاہتا ہوں"
لفظ نہ کی جگہ نہیں چاہئے "نہ" خلاف محاورہ ہے -

لطیفے

داغ کی شوخی طبع اس کی شاہد ہے کہ وہ بہت حاضر جواب اور بذلہ سنج انسان تھے - ان کے متعدد لطیفے سوانح نگاروں نے نقل کئے ہیں - یہاں وہ چند لطائف نقل کئے جاتے ہیں جو ان حضرات سے رہ گئے ہیں -

فیروز رام پوری داغ کے خاص شاگرد تھے - انھوں نے داغ کے خطوں کے مسودے اپنے پاس رکھنے کا التزام کیا تھا - ان میں سے چند مسودے کتاب خانہ رام پور کے لئے میں نے خرید لئے تھے - ان مسودوں میں حسب ذیل لطیفہ انھوں نے نقل کیا ہے :-

بے نظیر کا میلہ ہے، استاد بھی ایک جگہ چند آدمیوں سے گفتگو میں مشغول ہیں - ادھر سے علی اصغر خاں صاحب جنرل مرحوم تشریف لائے سلام علیک کی استاد نے نہ سنا - دوبارہ پھر سلام علیک کی، پھر نہ سُنا - صاحب زادہ صاحب بولے کہ "اوہو نواب مرزا تمھارا تو مزاج ہی نہیں ملتا" بولے ہاں، حضور وہ ایسا تیسا نہ ملے میں تو آپ کا تابعدار ہوں"

عرش گیاوی صاحب نے حیات تسلیم میں لکھا ہے :-

"ایک صاحب فرماتے تھے کہ نواب کلب علی خاں صاحب کا عہد تھا - بحر، قلق، اسیر، امیر، منیر وغیرہ موجود تھے جب داغ صاحب کے پڑھنے کی نوبت آئی تو مشاعرہ گونج اٹھا اس مشاعرے میں منیر اپنی بے مثل غزل پڑھ چکے تھے - مگر وہ عام فہم شعر یہاں کہاں تھے - داد دل خواہ نہ ملی - داغ کی واہ واہ مرحوم منیر پہ گراں گزری، مشاعرے سے باہر آکر داغ کا ہاتھ پکڑلیا اور کہا "کیوں میاں داغ، کیا تمھاری غزل مجھ سے بھی زیادہ پرزور تھی ؟" داغ نے کہا "ہرگز نہیں میری کیا طاقت کہ آپ کے سامنے زبان کھولوں مگر حضرت قبول خاطر و حسنِ سخن خدا داد است" - درمیان میں چند صاحب یہ گفتگو کرتے نظر آئے کہ "بھائی غزلیں تو سبنے پڑھیں مگر جب زاغِ بیابانی نے اپنا منھ نکالا تو پھر سارے عندلیب اپنا نغمہ بھول گئے" داغ کو وہ داد ملی کہ اللہ اللہ - خود نواب صاحب بہادر لوٹ لوٹ گئے - داغ نے منشی اسمٰعیل حسین منیر یادگار ناسخ سے کہا "حضرت اس مقبولیت کو کیا کہئے" منیر مرحوم چپ ہوگئے"

غیر مطبوعہ اشعار و مکاتیب

داغ کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط اور اشعار بھی دستیاب ہوئے ہیں - ذیل میں چند فارسی اور ایک اردو قطعہ نقل کیا جاتا ہے - قطعہ کسی مسجد کا سال تعمیر بتاتا ہے - قطعہ یہ ہے :-

کی بنا مسجد بیتِ مقدس کی طرح نورانی
داغ نے اس کی یہ کہی تاریخ نادرِ عصر کعبۂ ثانی
۱۳۰۴ھ

فارسی خط سب کے سب نواب سید یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں والی رام پور کے نام ہیں :-

(۱)

نواب صاحب قدر دان فیض رساں غریب پرور عدل گستر سلامت

بعز عرض می رساند کہ دریں ایام میمنت و فرحت انجام کہ نغمۂ بلبل در ہفت پردۂ نیلگونِ فلک رسیدہ، و آوازِ دکلبانگِ شادمانی در گنبدِ نیلوفری پیچیدہ ساقی موسم از مینائی سرد مہی نشۂ بادہ بے غمی در دماغ اہلِ روزگار رسانیدہ و زمانہ بساط مجلس آرائی و بزم پیرائی بریں صفحۂ صندل بہمہ گردانیدہ - یعنی مژدۂ مسند نشینی[۲] آن والا گہر در عالمیان عالم عالم است، و نوید جلوہ افروزی

[illegible]

ذات عالی درجہانیاں جہاں جہاں - از شوقِ دیدار فائض الانوار حالتے دارم کہ از معائنہ اش نرگس حیران - کارساز حقیقی سببے سازد کہ ایں فدوی شرف اندوز آستانِ فیض نشان گشتہ کامیاب باشد کہ از مدت مدید و عرصۂ بعید روز و شب درہمیں امیدواری می گزرد۔ مگر سر انجام ہر کار بر وقت منحصر است - بیت :-

الٰہی تاکہ جہانست، درجہاں باشی　　مدام بر سر مردم خدائے گاں باشی

اللہ تعالیٰ ذاتِ والاصفات را تا ابدالدہر سلامت دارد، و بر دوستان راسخ الاعتقاد فرخ و مبارک کناد، برب العباد۔

عرضی نواب مرزا مورخہ نہم شعبان ۱۲۷۱ھ

(۲)

نواب صاحب غریب پرور فیض گستر سلامت

بعد عرض می رساند

دریں ہنگام مسرت التیام مژدۂ فرحت افزا و نوید بہجت پیرا بگوشِ ہوا خواہان در رسید - یعنی خلعتِ مسند نشینی [1] رام پور از ذاتِ مبارک زینت یافت - ہزار ہزار شکر بدرگاہِ مستجاب الدعوات بجا آوردہ - اللہ تعالیٰ ذات فیض آیات را مدام بہ حفظ و امن خود دارد

الٰہی، تاکہ جہانست، درجہاں باشی　　مدام بر سر مردم خدائے گاں باشی

عرضی نمک خوار نواب مرزا داغ مورخۂ نہم دسمبر ۱۸۵۵ء

(۳)

غریب پرور، فیض گستر، دستگیر درماندگان، تسلی بخش بے کساں، حاجت روائے عالم و عالمیاں

مخدومِ جہاں و جہانیاں سلامت

بعد عرض می رساند

عجب درد است جانم را، نمی دانم کہ چوں گویم　　دلا، خوں شو کہ تا برحال خود یک لحظہ خوں گویم

ہر آنچہ زاد بناچار بایدش نوشید　　ز جامِ دہر می کلِ من علیہا فان،

دردے دارم کہ دوائش محال و مرضے دارم کہ نمارش دشوار - یعنی بتاریخ دہم جولائی ۱۸۵۶ء مہر سپہر سلطنت، مرزا محمد سلطان فتح الملک شاہ ولی عہد بہادر بہ وبائے ہیضہ ازیں جہان فانی رحلت فرمودند---- و از وقوع ایں حادثۂ جانکاہ و صدمۂ دل خراش شورِ فغانِ عالمیان تا فلک الافلاک رسید، و در شہر شاہجہاں آباد صورت تباہی نمودار گردید - دریں دودمان والا چناں شخص صاحب تدبیر و لئیق و وجیہ بعد چند سلطنت پیدا گردیدہ بود کہ نشانۂ تیر مرگ ناگہاں گشت - زباں راچہ یارا کہ حال ایں واقعہ بیاں نماید، و قلم راچہ مجال کہ تحریر سازد - ہر چند دل بیتاب را صبر می دہم، مگر صبر کجا - برق کردار بیقرار یست و ابر وار گریہ و زاری - و اکنوں دفعیۂ ایں مرض بغیر مرحمت و نظر پرورش والا دشوار - بیت

مزد کار نیکواں　ضائع نماند نزدِ حق　　لا یضیع اللہ فی الدارین اجر المحسنین

---

(۱) نواب فردوس مکاں کو حکومت انگریزی کی طرف سے خلعت مسند نشینی ملا تھا اور اس کا جشن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ اخبار الصنادید میں اس جشن کی تاریخ مذکور نہیں - لیکن عمدہ خانم کے خط مورخہ ۲ دسمبر ۱۸۵۵ء سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تاریخ سے قبل (غالباً نومبر میں) یہ تقریب عمل میں آئی تھی، اور خود نواب گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی نے رام پور آکر یہ خلعت نواب صاحب کو پہنایا تھا۔ [1] نواب فردوس مکاں کی مسند نشینی کی تاریخ دو شنبہ ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ (یکم اپریل ۱۸۵۵ء) ہے

امید دارم کہ مدام از صحائف مزاج فیض امتزاج اطلاع یافتہ مسرور و مستبشر گشتہ باشم کہ خاطر نیاز مظاہر متعلق می ماند - و کنایتہً بخدمت علی بخش خاں صاحب[1] نوشتہ ام - یقین است کہ بموقف بندگان عالی عرض خواہند نمود - آیندہ ہر چہ مرضی مبارک واجب بود - عرض نمود - الٰہی آفتاب ابہت و کامگاری تاباں باد -

عرضی

نمک خوار قدیم، نواب مرزا داغ مرقومہ، ۱۸ جولائی ۱۸۵۶ء

مرزا محمد سلطان کا عرف مرزا فخرو تھا - ۱۸۱۲ء میں پیدا ہوئے تھے مرزا دارا بخت کے ۱۸۴۹ء میں انتقال کر جانے پر بڑی رد و کد کے بعد ۱۸۵۰ء میں ولی عہد مقرر ہوئے - ان کے اچانک انتقال کرنے کا سبب بہ خیال اکثر یہ تھا کہ شاہ ظفر کی چہیتی بیگم نواب زینت محل اپنے بیٹے جواں بخت کی ولی عہدی کے درپے تھیں - انھوں نے کسی کے ذریعہ انھیں زہر دلوا دیا - لیکن میری دانست میں یہ صرف سوءظن تھا، جو ظاہری حالات کے تقاضے سے پیدا ہوگیا تھا - اگر اس میں کچھ اصلیت ہوتی، تو داغ کے یہاں اس کا اشارہ ضرور پایا جاتا -

مرزا فخرو شاعر بھی تھے - پہلے ذوق کے شاگرد تھے - ان کے انتقال کے بعد غالب کو کلام دکھانے لگے تھے - داغ نے انکا قطعۂ تاریخ انتقال بھی فارسی میں لکھا تھا - جو مہتاب داغ (ص ۳۰۰) میں چھپ چکا ہے اس کا آخری شعر یہ ہے:-

جوں داغ سال رحلت دل دردمند پرسید ۔۔۔ بکشیدہ آہ حسرت دو صد و دوازدہ بار

اس سے ۱۲۷۲ھ نکلتے ہیں -

امتیاز علی خاں عرشی

---

[1] یہ شیخ محبوب بخش بن شیخ امان اللہ نجیب آبادی کے بیٹے تھے - ۱۴ر شوال ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) کو نجیب آباد میں پیدا ہوئے - نواب فردوس مکاں نے "خان ساماں" کا عہدہ عطا کیا - ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی بڑی خدمت کی اور صلہ میں جاگیر پائی - ۲ر محرم ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) کو رام پور میں انتقال کیا - (اخبار الصنادید جلد ۱ صفحہ ۱۸۸ و تذکرہ کاملانِ رام پور صفحہ ۲۶۴ و مکاتیب غالب، حواشی صفحہ ۱۳۹ طبع چہارم)

[2] یہ کنایہ غالباً ملازمت یا وظیفہ کے تقرر کا ہوگا، اس لئے کہ ولی عہد کے انتقال کے بعد ان کے اور ان کی والدہ کے مصارف کی کفالت کرنے والا کوئی نہ رہا تھا -

---

"من و یزداں"

کے متعلق اکثر حضرات یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ دو جلدوں میں شایع ہوئی ہے، حالانکہ وہ ایک ہی جلد میں تمام ہوگئی ہے -

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ بالکل دوسری چیز ہے اور من و یزداں کے کسی مضمون کا تعلق اس سے نہیں، اسی طرح مذہب بھی ایک علحدہ چیز ہے لیکن مناسب یہی ہے کہ مذہب کے موضوع پر ان تینوں کتابوں کا مطالعہ کیا جائے - من و یزداں کا دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے اور مئی تک غالباً شایع ہو جائے گا - منیجر

"من و یزداں" کامل

دوسرا اڈیشن زیر طبع ہے

جو مئی میں شایع ہو جائے گا

قیمت سات روپے آٹھ آنے

علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

عہدِ حاضر کی فلک پیمائیاں

دنیا کے دوسرے علوم و فنون کے ساتھ اس وقت فنِ تعمیر میں بھی غیر معمولی ترقیاں ہوئی ہیں یہاں تک کہ وقت حاضر کا فن تعمیر، قدیم فن تعمیر سے بالکل مختلف ہے۔

تعمیر میں حسن و زیبائش کے علاوہ، اس کا شاندار ہونا بھی ہمیشہ پیش نظر رہا ہے اور عہدِ قدیم کے آثار سے پتہ چلتا ہے کہ عمارتوں کی خوبصورتی کے ساتھ ان میں بلندی کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی، چنانچہ اس سلسلہ میں عہدِ عتیق کے برج بابل اور عہد وسطیٰ کے قطب مینار سے سب واقف ہیں، لیکن عہد حاضر میں عمارتوں کو بلند بنانے کا خیال بالکل دوسری نوعیت رکھتا ہے، پہلے تو عمارت کی بلندی صرف شان و شوکت کے اظہار کے لئے ہوتی تھی، لیکن اب بڑے بڑے شہروں میں آبادی کی کثرت اور زمین کی تنگی کی وجہ سے اونچی عمارتیں بنائی جاتی ہیں، تاکہ جن آدمیوں کے لئے زمین پر جگہ نہیں نکل سکتی ہے، ان کے لئے زمین سے اوپر فضا میں جگہ پیدا کی جائے۔

اب سے پہلے تعمیر کے لئے اینٹ، پتھر، چونے، لکڑی کی ضرورت ہوتی تھی اور ان کی مدد سے بہت زیادہ بلند عمارتیں نہیں بن سکتی تھیں اور اگر اس کا امکان بھی تھا تو اس کے لئے بڑے صرف اور وقت کی ضرورت ہوتی تھی پھر بھی ان کی مضبوطی مشتبہ رہتی تھی، لیکن اب سیمنٹ اور لوہے نے اس فن کو وقت، صرف اور استحکام ہر لحاظ سے بہت زیادہ مقبول بنا دیا ہے۔

یوں تو اس وقت دنیا میں کوئی ملک ایسا نہیں، جہاں عجیب و غریب نمونوں کی عمارتیں نہ بنتی ہوں، لیکن جس حد تک بلندی کا تعلق ہے نیویارک کو خاص شہرت حاصل ہے اور یہاں یہ خبط اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ پندرہ بیس منزل کی عمارتیں طیار کرنا تو بہت معمولی بات ہوگئی ہے اور اب نوبت درجنوں منزل تک پہونچ گئی ہے۔ ایسی عمارتوں میں نیویارک کی ایک تعمیر جسے چین ٹاور کہتے ہیں وہ بھی معمولی سمجھی جاتی ہے کیونکہ وہ صرف ۲۶ منزلیں رکھتی ہے۔ بعض دوسری مشہور عمارتیں یہ ہیں:-

۱- وولورتھ بلڈنگ جس کی بالائی منزل کا برج زمین سے ۷۶۲ فٹ کی بلندی پر واقع ہے جہاں اکثر بادل منڈلاتے رہتے ہیں۔

۲- دفتر ٹیلی فون کی عمارت بھی نیویارک کی خاص عمارت ہے۔ یہ ۲۱ منزلہ عمارت ہے اور ایک نئے نمونہ پر طیار کی گئی ہے۔

۳- کرائسلر بلڈنگ، جو مشہور کارخانہ موٹر سازی سے تعلق رکھتی ہے ۶۸ منزلیں رکھتی ہے۔

۴- مٹروپولیٹن بیمہ کمپنی کی بلڈنگ ۱۰۰ منزل کی عمارت ہے جس میں ۳ ہزار آدمی رہتے ہیں۔

۵- لیک مچیگن کی ایک بلڈنگ ہے جو تجارتی بازار کی حیثیت رکھتی ہے، اس میں دن کو ۴۰ ہزار سے زیادہ آدمی کام کرسکتے ہیں

۶- ٹریول اینڈ ٹرانسپورٹ بلڈنگ کی بلندی ایک فرلانگ سے زیادہ ہے۔

دُنیا کی بلند ترین عمارت

اس وقت دنیا کی بلند ترین عمارت نیو یارک کی "امپائر اسٹیٹ بلڈنگ" ہے۔ یہ دو ایکڑ زمین پر قایم کی گئی ہے اور شہر کے اس حصہ میں ہے جہاں زمین کی قیمت اس وقت ۹۰ پونڈ فی مربع فٹ ہے اس کی بلندی ۱۴۷۲ فٹ یعنی دو فرلانگ سے زیادہ ہے اور اس کے ڈھانچہ میں ۶۰ ہزار ٹن لوہا صرف ہوا ہے، اس کے فرش کے لئے جتنا سنگ مرمر درکار ہوا تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ فرانس، اٹلی، بلجیم اور جرمنی کی تمام کانیں ایک سال کے لئے خالی ہوگئی تھیں۔ اس عمارت میں بجلی اور ٹیلی فون کے جو تار استعمال ہوئے ہیں انکی لمبائی ۳۲۰۰ میل ہے اور جتنے پائپ لگے ہیں ان کو اگر برابر برابر رکھا جائے تو ۵۰ میل تک پہونچ سکتے ہیں۔

اس عمارت میں ۱۰۲ منزلیں ہیں۔ اور چڑھنے کے لئے ۶۲ لفٹ ہیں اور ان کے علاوہ ۱۸۶۰ زینے بھی۔ اس میں ۳۰۰ عورتوں سے زیادہ صرف جھاڑنے پوچھنے کے لئے متعین ہیں۔ صرف اس کے ٹاور میں ۳ ہزار بجلی کے قمقمے نصب ہیں جن کی دیکھ بھال کے لئے ایک آدمی کو روزانہ آٹھ گھنٹے صرف کرنا پڑتے ہیں۔ اس کا بالائی برج اتنا بلند ہے کہ وہاں کا درجۂ حرارت ۴ سے ۹ درجہ تک بہ نسبت زمین کے کم رہتا ہے۔ ہوا اس پر ۶۰ سے ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرتی ہے، اور کبھی کبھی اس کی رفتار ۱۲۵ میل فی گھنٹہ ہوجاتی ہے۔ یہ عمارت اسٹیل کے ڈھانچوں پر اس قدر مضبوط طیار کی گئی ہے کہ اگر ہوا ۹۰ میل کی رفتار سے برابر ۹ گھنٹے تک چلتی رہے تو برج صرف ڈیڑھ انچ کے قریب جھک جاتا ہے۔

یہ برج ۶ ٹیلی ویژن اور تین براڈ کاسٹنگ کمپنیوں کا مرکز ہے۔ ٹیلی ویژن کے لئے جو مستقل اس میں قایم کیا گیا ہے خود اس کی بلندی ۱۷ منزلہ عمارت سے کم نہیں ہے اور اس کی طیاری میں سات لاکھ پونڈ صرف ہوئے ہیں۔ پچھلے سال آٹھ لاکھ ۵۰ ہزار آدمیوں نے اس کو آکر دیکھا۔ جب سے یہ عمارت طیار ہوئی ہے اس وقت سے لیکر اس وقت تک ایک کرور ۴۰ لاکھ آدمی اس کو دیکھ چکے ہیں اور دس لاکھ ڈالر ٹکٹ کی آمدنی ہوئی ہے، اس عمارت کی سب سے اوپر منزل پر جاکر دوربین کی مدد سے ۴۰ میل دور سمندر کا جہاز بالکل صاف نظر آتا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ عمارت نیو یارک کے اس حصہ میں بنائی گئی ہے جہاں سے روزانہ ۴۰ ہزار موٹر اور ۲ لاکھ پیدل چلنے والے آدمی گزرتے ہیں اور یہاں کوئی جگہ ایسی نہیں ہے جہاں تعمیر کا سامان یا لوہے کے گرڈر وغیرہ رکھے جاسکتے۔ چنانچہ انتظام یہ کیا گیا تھا کہ جس وقت کارخانوں سے تمام سامان روانہ ہوتا تھا اس کے ۸۰ گھنٹوں کے اندر تمام سامان عمارت میں لگ جاتا تھا اس طرح ۲۳ ہفتوں میں اس عمارت کا فولادی ڈھانچہ طیار ہوگیا تھا اور آٹھ مہینے میں ساری تعمیر مکمل ہوگئی تھی۔

جگر بریلوی:-

شعلۂ حسن بھڑکنے لگا اب دل کے قریب
گرمئ شوق ہو یا آ گئے منزل کے قریب

روشن آنکھیں ہوئی جاتی ہیں تو دل محوِ نشاط
لے ہی آئی ہمیں وحشت تری محفل کے قریب

شوق نے بڑھکے رگ و پے میں عجب حال کیا
پاؤں اُٹھتے نہیں آکر تیری محفل کے قریب

پھٹنے لگتا ہے عجب جوشِ طرب سے سینہ
مسکراتا ہوا آتا ہے جو وہ دل کے قریب

نیند آنکھوں میں ہے یا کیف ہم آغوشی ہے
جیسے محبوب کا دل اب ہو مرے دل کے قریب

دل اُچھلتا ہے کہ ہوتا ہے جگر بیڑا پار
شاید آ پہونچا سفینہ مرا ساحل کے قریب

میرزا غالب نقاد کی حیثیت سے

تنقید کا مطلب ہے جانچنا اور پرکھنا۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی علمی یا ادبی مرقع یا اس کے کسی جزو کی اچھائی برائی اور حسن و قبح کو خوب دقتِ نظر سے جانچا اور پرکھا جائے۔ عبارت، اسلوب بیان اور ترتیب و تشریحِ مطالب کا اندازہ کرتے ہوئے کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا جائے۔

میرزا غالب کی صلاحیت نقد و نظر پر گفتگو شروع کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند باتیں بطور تمہید عرض کر دی جائیں مثلاً میرزا غالب کے زمانہ میں فنِ تنقید ارتقا کے اس درجہ پر نہیں پہونچا تھا جس پر یہ آج کل پہونچا ہوا ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ آزادانہ اور حق شناسانہ جایزوں کا طریقہ بھی بڑی حد تک مفقود تھا۔ یا تو تقریظیں لکھی جاتی تھیں، جو مصنف، کتاب اور اس کے نفس مضمون کے بارے میں نہایت عجیب و غریب اور ایک حد تک مضحکہ خیز تحسین و ستایش سے لبریز ہوتی تھیں یا مخالفین تعریضات کی برچھیاں اور تلواریں لیکر صاحبِ تصنیف پر یورش بول دیتے تھے اور کتاب کی اچھائیوں سے یا تو بالکل قطع نظر کر لیتے تھے یا پھر ان اچھائیوں کو بھی برائیوں کا جامہ پہنا کر منظرِ عام پر پیش کرتے رہتے تھے۔ میرزا کی تصانیف میں تقریظیں بھی موجود ہیں اور "قاطع برہان" کی اشاعت سے لیکر تا دمِ مرگ انھیں زہرِ تعریضات کے جام بھی پے بہ پے پینے پڑے۔

ادبیات میں تنقید کے لئے صرف وسعتِ معلومات کافی نہیں۔ معلومات کے علاوہ نقاد کے لئے صاحبِ ذوق ہونا بھی ضروری ہے اور ذوق کا درجہ جتنا بلند ہوگا، اتنا ہی اُس کا معیارِ تنقید بلند ہوگا۔ تنہا وسعتِ معلومات کی بنا پر ہم یہ تو جان سکتے ہیں کہ فلاں چیز صحیح ہے یا نہیں ہے۔ لیکن ادبیات میں حُسن کا درجہ نفسِ صحت سے اوپر ہے۔ یعنی یہ کہ صحیح چیز ٹھیک اپنے موقع اور محل پر استعمال ہوئی یا نہ ہوئی۔ نظم و نثر میں ہمارے سامنے کئی ایسی چیزیں سامنے آتی رہی ہیں، جن کی صحت میں کسی کو کلام کی گنجایش نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ قواعدِ زبان اور لغت کی رو سے ان پر انگلی نہیں رکھی جا سکتی۔ لیکن ضروری نہیں کہ معیارِ ذوق کی ترازو میں بھی وہ پوری اُترتی ہو۔

میرزا غالب کی فارسی اور اُردو نظم و نثر میں پیشِ نظر موضوع کے متعلق بکثرت سامان موجود ہے، بعض کتابیں تو مستقل طور پر بائے بسم اللہ سے لیکر تائے تمت تک تنقید ہی کے تحت میں آتی ہیں۔ مثلاً "قاطع برہان" "لطایف غیبی" "سوالات عبدالکریم" اور "تیغ تیز" لیکن ان تصانیف کا جایزہ لینے کی شکل یہی ہے کہ سب سے پہلے ان کتابوں سے مفصل اقتباسات پیش کئے جائیں۔ جن پر میرزا غالب نے یہ تنقیدی کتابیں لکھیں۔ پھر میرزا کی کتابوں سے مختلف ٹکڑے سنا کر موازنہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ حق بہ جانب کون ہے۔ اس کے بغیر میرزا کی شانِ تنقید واضح نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس قسم کی تفصیلات ایک سرسری گفتگو کے دائرے سے خارج ہیں۔ لہذا میں جو کچھ عرض کروں گا اس کی حیثیت محض اشاروں کی ہوگی۔ امید ہے کہ اس طرح بھی نقادی کے اس جوہر کی چہرہ کشائی کا بندوبست ایک حد تک ضروری ہو جائے گا جو قدرت نے مرزا کی طبیعت میں ودیعت کیا تھا

میرزا جس ماحول میں پیدا ہوئے، جس ماحول میں انھوں نے پرورش پائی اور علم حاصل کیا، جس ماحول میں ان کی مشقِ سخن کا آغاز ہوا۔ اس کے مروّجات و معمولات سے وہ یک قلم آزاد و بے نیاز نہیں رہ سکتے تھے تاہم انھوں نے جس طرح

اپنے نادر اسلوب فکر سے اور قدیم اور دور جدید میں برزخ کا مقام پیدا کیا۔ اسی طرح تنقید میں بھی ان کو برزخ ہی کا مرتبہ حاصل ہے یعنی پچھلوں سے کامل قطع تعلق نہ کرتے ہوئے، آنے والوں کے لئے نئے راستے پیدا کئے اور اپنی انقلاب آفریں فطرت سے کام لے کر جدید دور کی بنیادیں استوار فرمائیں۔ یہ ان کی نقاد طبیعت اور ان کے ذوقِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ اپنے عہد کے ادبی عیوب کا انھیں بہت جلد پورا احساس ہوگیا اور ان عیوب سے نہ محض خود جلد از جلد کنارہ کش ہوگئے بلکہ دوسروں کو بھی کنارہ کشی کی موثر دعوت دی نقادانِ فن کی خدمت میں غالباً یہ عرض کرنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے ادبیات کو جس نہج پر میرزا نے ڈالا تھا، یہ آج تک اسی نہج پر جاری ہیں۔

"پنج آہنگ" کا دیباچہ میرزا نے اس زمانہ میں لکھا تھا جب وہ جوانی کے ابتدائی مراحل میں تھے۔ اس میں خطوط نویسی کے جو اصول و معانی پیش کئے ہیں۔ انھیں سامنے رکھ کر غور فرمائیں گے تو صاف آشکارا ہوجائے گا کہ یہ انیسویں صدی عیسوی کے عشرہ ثالثہ کی صدا نہیں ہے۔ جبکہ ہر بات کو زیادہ سے زیادہ پیچ دیکر کہنا لازمۂ علم و فضل سمجھا جاتا تھا۔ یہ بیسویں صدی عیسوی کی صدا ہے جبکہ تکلفات کے سراسر لغو و لایعنی سمجھا جاتا ہے۔ میرزا کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے۔

نامہ نگار کو چاہئے کہ نگارش کو مقصود سے زیادہ دور نہ لے جائے اور تحریر میں تقریر کا رنگ پیدا کرے۔

نفس مطلب کو ایسے انداز میں قلم بند کرے کہ اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

اگر نامہ نگار کے سامنے زیادہ مطالب ہوں تو تمام مطالب کو انتہائی احتیاط سے جدا جدا بیان کرے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ سب خلط ملط ہوجائیں اور پڑھنے والے کے لئے اُلجھن کا باعث بنیں۔

نامانوس الفاظ اور دقیق استعارات سے عبارت کو پاک رکھا جائے۔

حتے الامکان تحریر کو طول نہ دیا جائے۔

لطفِ تحریر کا تقاضا یہ ہے کہ ایک لفظ بار بار استعمال نہ کیا جائے۔

زبان کی خوبی کو ہاتھ سے نہ دیا جائے۔ لکھنے والے کو پوری کوشش کرنی چاہئے کہ سادگی اور لطافت اسکی عادت بن جائے

کیا یہ روشن ہدایتیں صرف وسعت معلومات سے پیدا ہوسکتی ہیں؟ میرزا سے پہلے بھی بڑے بڑے عالم گزر چکے ہیں اور ان کے زمانہ میں بھی یگانۂ روزگار فاضلوں کی کمی نہ تھی لیکن ایسی باتیں صرف علم سے نہیں۔ بلکہ علم کے علاوہ حسن ذوق۔ کمال جدتِ نظر دقتِ اجتہاد اور مشق و مزاولت سے پیدا ہوتی ہیں۔ نامہ نگاری کے یہی روشن اصول تھے جو میرزا کے اُردو مکاتیب میں بوجہ احسن استعمال ہوئے اور ان مکاتیب کو وہ درجۂ کمال حاصل ہوا کہ ایک صدی گزر جانے پر بھی وہ اُردو زبان میں بے مثال ہیں۔

میرزا نے بھی اگرچہ اپنے دوستوں کی فرمائشوں پر پرانے انداز میں چند تقریظیں لکھیں لیکن وہ اپنے طریق فکر و نظر کو کاملاً نہ بدل سکے اور اپنا خاص مجتہدانہ نقطۂ نگاہ نہ چھوڑ سکے۔ ان کے عزیز شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے دیوان کا دیباچہ لکھوایا۔ میرزا عام رواج کے مطابق تفتہ کی مدح میں زیادہ پھیلاؤ سے کام نہ لے سکے۔ یہ امر غالباً تفتہ کے لئے شکایت کا موجب بنا۔ دیکھئے مرزا جواب میں کیا فرماتے ہیں۔

"کیا کروں اپنا شیوہ ترک نہیں کیا جاتا۔ وہ روش ہندوستانی فارسی لکھنے والوں کی مجھ کو نہیں آتی کہ بالکل بھاٹوں کی طرح بکنا شروع کردیں۔ میرے قصیدے دیکھو۔ تشبیب کے شعر بہت پاؤ گے اور مدح کے شعر کمتر۔ نثر میں بھی یہی حال ہے۔ نواب مصطفےٰ خاں کے تذکرے کی تقریظ ملاحظہ کرو کہ ان کی مدح کتنی ہے۔ میرزا رحیم الدین بہادر حیا تخلص کے دیوان کا دیباچہ دیکھو وہ جو تقریظ دیوانِ حافظ کی بموجب فرمائش "جان جاکوب بہادر" کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ فقط ایک

بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح سرائی ہے اور باقی ساری نثر میں کچھ اور ہی اور مطالب ہیں۔ واللہ باللہ کسی شہزادے یا امیر زادے کے دیوان کا دیباچہ لکھتا تو اس کی مدح اتنی نہ کرتا کہ جتنی تمہاری مدح کی ہے۔ ہم کو اور ہماری روش کو اگر پہچانتے تو اتنی مدح کو بہت جانتے۔"

یہ نقاد فکر اور حقایق رس نگاہ تھی۔ جس نے میرزا کو پرانی روش سے ہٹا کر نئی راہ پر ڈالا یہی روش ہے جو آج ادبیات میں وجہ افتخار مانی جاتی ہے۔ یہی نقاد فکر اور حقایق رس نگاہ تھی جس نے شاعری میں میرزا کے اسلوب بیان کو شانِ امتیاز بخشی وہ بالکل صحیح کہتا ہے ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مولانا فضلِ حق خیر آبادی میرزا کے عزیز دوست تھے۔ جب ان میں اور شاہ اسمعیل میں مسئلہ امکانِ نظیر و امتناعِ نظیر پر بحث چھڑی تو مولانا فضل حق نے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید میں میرزا سے ایک مثنوی لکھوائی جو ان کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہے۔ لیکن میرزا کی نقاد طبیعت مولانا کے بتائے ہوئے نظریئے کو قبول نہ کر سکی اور انھوں نے مثنوی کے آخر میں صاف لکھدیا۔

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود
رحمۃً للعالمینے ہم بود

یہ بات مولانا فضل حق کی رائے کے مطابق نہ تھی اس پر وہ بہت بگڑے۔ میرزا نے ان کی دلداری کے لئے مثنوی میں چند شعر بڑھا کر اپنی اس بات کی تغلیط کر دی۔

سرسید احمد خاں مرحوم نے بڑی محنت سے ابوالفضل کی "آئینِ اکبری" کی تصحیح فرمائی اسے چھپواتے وقت میرزا کی نقاد طبیعت رہائی مدح وستایش کے لئے طیار نہ ہوسکی۔ وہ انگریزوں کے عہد کی ایجادات سے بہت متاثر تھے اور اکبر کے زمانہ کے آئین کو تقویم پارینہ سمجھتے تھے۔ لہذا بے تکلف ان چیزوں کو سراہنے لگے جو انگریزوں کے ذریعہ سے اس ملک میں پہونچی تھیں۔ مثلاً پتھر کو پتھر پر رگڑ کر آگ سلگانے کی بجائے دیا سلائی سے کام لینا۔ بھاپ سے جہاز اور ریل گاڑیاں چلانا۔ تار برقی کے ذریعہ سے دور دور کی خبریں لمحہ بھر میں منگالینا۔ فرماتے ہیں :-

آتشے کز سنگ بیروں آورند
ایں ہنرمنداں زخس چوں آورند
تا چہ افسوں خواندہ اند ایناں برآب
دود کشتی راہمے راند در آب
گر دخاں کشتی بہ جیجوں مے برد
گر دخاں گردوں بہ آموں مے برد
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند
حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ایں نمے بینی کہ ایں دانا گروہ
در دو دم آرند حرف از صد کروہ

آخر میں سرسید کے پاسِ خاطر سے کہتے ہیں :-

غالب آئینِ خموشی دل کش است
گرچہ خوش گفتی نہ گفتن ہم خوش است
در میاں سید پرستی دین تست
از ثنا بنذر دعا آئین تست
ایں سراپا فرۂ فرہنگ را
سید احمد خانِ عارف جنگ را
ہرچہ خواہد از خدا موجود باد
پیش کارش طالع مسعود باد

اب میرزا کی نقادی کی ایک دو مثالیں اُردو میں بھی ملاحظہ فرمائیے۔ عرفی کے حمد والے قصیدے کا مشہور شعر ہے :-

من کہ باشم عقل کل را ناوک اندازِ ادب
مرغِ اوصاف تو از اوجِ بیاں انداختہ

عام شارحین اس کی جو شرح فرماتے تھے وہ خود میرزا کی زبان سے سنئے۔ فرماتے ہیں:-

اس کی جو شرحِ چھاپے میں لکھی ہے اس کو ملاحظہ کیجئے اور معنی میری خاطر نشان کیجئے تو سلام کروں۔ پہلی نظر یہاں لڑنی چاہئے "از اوجِ بیاں انداختہ" کا فاعل کون ہے اور مفعول کون ہے؟ اگر عقل کل انداختہ کا مفعول اور "منکہ" کے کاف کو کرامیہ ٹھیراؤ گے تو بے شبہ انداختہ کے دو فاعل ٹھیریں گے۔ "ایک ناوک انداز ادب" اور "ایک مرغ اوصاف تو" ایک فعل دو فاعل، یہ کیا طریق اور کیسی تحقیق ہے؟ مروجہ شرح پر تنقید کے بعد خود یوں معنی بیان کرتے ہیں۔

"من انداختہ" کا مفعول "رامقدر" منکہ کا کاف توصیفی "ناوک انداز ادب" ادب آموز یعنی استاد "مرغ اوصاف تو" فاعل (مطلب یہ ہوا کہ) مجھ کو کہ عقل کل کا استاد ہوں۔ یوں مرغ توصیف نے اوجِ بیان سے گرا دیا۔ عقل کل تک کہ وہ علوین میں اعلیٰ ہے اس کا ناوک پہونچ سکتا ہے۔ مگر میرے اوصاف کا مرغ اس مقام پر ہے کہ جہاں اس ناوک انداز کو ناوک پہونچانے کی گنجائش نہیں۔ اوجِ بیان سے گرنا عاجز آنا ہے۔ قدرت وہ کہ عقل کل سے بھی زیادہ اور عجز یہ کہ روح بیان سے گر گیا۔ اچھا مبالغہ ہے۔ مرغ اوصاف کی بلندی کا اور کیا خوب مضمون ہے، اظہار عجز باوجود امورے قدرت کا۔ ظہوری کا ایک شعر:-

مروت کرد شبہا بر تو سیر بام و در لازم ۔۔۔ نمے باشد چراغے خانہ ہائے بے نوایاں را

اس کا عام مطلب یہی سمجھا جائے گا کہ تو مروت سے کام لے کر راتوں کے اندھیرے میں کوٹھے پر چڑھ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے کہ بے نواؤں کے گھروں میں ایک دیا تک موجود نہیں۔ اب میرزا سے اس شعر کی شرح سنئے۔ پھر اندازہ فرمائیے کہ میرزا کیوں ظہوری کو "روح و رواں معنی" کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں:-

ظہوری کا ممدوح اور معشوق ایک ہے یعنی سلطان جلیل القدر ابراہیم عادل شاہ۔ بادشاہوں کے منظر بلند ہوتے ہیں اور کیا بعید ہے کہ رعایا اور ملازمین میں سے کچھ لوگ زیرِ قصر رہتے ہوں۔ اس واسطے بادشاہ دن کو اس منظرِ بلند پر نہیں چڑھتا کہ مبادا رعیت یا ملازموں کی جورو بیٹیاں نظر آئیں۔ رات کو ان کے گھر تاریک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بلند مقام پر چڑھا تو کچھ نظر نہیں آئے گا۔ یہ مدح ہوئی عفت کی اب ابہام کو سوچئے۔ ممدوح نے راتوں کو کوٹھے پر چڑھنا اپنے اوپر لازم کیا ہے۔ اس واسطے کہ (بے نواؤں کے) گھروں میں چراغ نہیں۔ اگر کسی کو کپڑے میں پیوند لگانا یا چمڑے کی کوئی چیز گانٹھنی یا کسی مریض کا تفحصِ حال منظور ہو تو وہ گھر اس ممدوح کے پرتو جمال سے منور ہو جائے۔ چراغ کی حاجت باقی نہ رہے۔۔۔۔ مروت کا مزہ وجدانی ہے۔ سوا اس لفظ کے کوئی لفظ یہاں کام نہیں آتا۔ اگر حفظ ناموس رعایا تو مروت ہے۔ اگر مفلسوں کی کار برآری ہے تو مروت ہے۔

اصل نقادی یہی ہے کہ نگاہ ایک ایک لفظ میں پھرے اور معلوم کرے کہ وہ کس غرض سے شعر میں لایا گیا اور مضمون شعر کی ترکیب و توضیح میں اس کا مقام اور اسکی حیثیت کیا ہے۔ یہ مرزا کی شانِ نقادی کی محض ایک جھلک تھی۔ اس بارے میں تفصیلی بات چیت کے لئے لمبی صحبت درکار ہے۔ (آہنگ)

غلام رسول مہر

جفر و رمل کی نایاب کتابیں

(۱) (عربی) مصباح الرموز۔۔ منقول از امام جعفر صادق۔ ۶ر

(۲) (عربی) علم جفر۔۔ منقول از امام جعفر صادق ۔۔ سے

(عربی) ترجمہ شریفہ ۔۔ منقول از محی الدین العربی

(فارسی) علم جفر۔ (عربی) کشف الساطع (جفر)۔ فارسی) مقصد قصی

(عربی) کتاب زایرجات و اشرف المربعات از امام غزالی

۳ (اردو) کوکب الرمل ۶ر۔ (اردو) محبوب الرمل صہ ۔۔۔

۴۔ (فارسی) مصداق الرمل۔ از محمد عطا لاہوری ۔۔ صہ ۔

(فارسی) انوار الرمل۔ از حاجی عبدالغنی شروانی ۔۔ عہ

۵۔ (فارسی) سراج الرمل۔ ۶ر۔ (فارسی) مجموعہ رسایل رمل سے

۶۔ (فارسی) خوابنامہ یعنی کامل التعبیر مطبوعہ بمبئی ۱۳۰۵ھ صفحہ ۳۱۰

صبحِ کاذب

خام کتنا تھا سیاست کے طبیبوں کا شعور،
کروٹیں برق نے لیں آنکھ شگوفوں کی کھُلی
روحِ معصوم شگوفوں کی سنانوں پہ تُلی
خون پانی ہوا دیوارِ گلستاں کی دُھلی
بن گیا زخمِ وطن چار ہی دن میں ناسور

برق لہرانے لگی وقت کے کاشانوں میں
گوہر و لعل کے فردوسِ بریں، جلنے لگے
مسند و تاج کے افلاک نشیں، جلنے لگے
صاحبِ مال و خداوندِ زمیں، جلنے لگے
شعلے لہرانے لگے فریاد نیستانوں میں

چادرِ زہرہ و ناہید و قمر جلنے لگی
تلملا اُٹھا غمِ ہوش ربائے مریخ
آسماں چیر گئی حوروں کی سہمی ہوئی چیخ،
چھپ گئی گہر میں تہذیب کی روشن تاریخ
صبح خود چہرے پہ گلگونۂ شب ملنے لگی

زندگی ہو گئی خود اپنی نگاہوں میں حقیر
بے مہ و کاہکشاں راتیں یہ کاذب صبحیں
مسکرائیں کہیں تارے نہ کہیں پھول کھِلیں
شبِ دیجور کی تعظیم کو خورشید جھکیں
ہائے آزاد غلاموں کا یہ مجبور ضمیر

یہ لہو تھوکتی شبنم یہ دھواں دیتے سحاب
کانپتے زمزمے یہ ہانپتے طاؤس و نفیر
یہ دھڑکتے ہوئے سینوں میں مناجات کے تیر
یہ قبائے شہی یہ نیت کیخسرو و میر
ہائے یہ نیلم و الماس و زمرد کے سراب

دولت و زر کی نمائش یہ لباسوں کا نکھار
یہ سیاست کا خم و چم یہ عقیق و گوہر
یہ چمکتے ہوئے عہدے یہ چہکتے لیڈر
غمِ تیزاب میں ہیں شہد کی مکھی بن کر
ملک و ملت کے ڈرامے کے یہ "جھوٹے کردار"

فرطِ غم سے لہو دینے لگے یہ ساغر و جام
دھوپ کہسار کی گلزار تک آپہونچی ہے
زندگی مرحلۂ دار تک آپہونچی ہے
بات چنگیز سے فنکار تک آپہونچی ہے
شعلۂ برق میں ملفوف ہیں اب کوشک و بام

وادیٔ نیل سے طوفاں کی صدا آتی ہے
اُڑ گئے خس کی طرح قافلۂ مصر و عجم
جانِ یوسف پہ عزیزوں کا ہوا خوب کرم
ساحلِ ضبط سے ٹکرانے لگا دجلۂ غم
کشتیٔ عمر کی ہو خیر، بلا آتی ہے

اب ہے تکلیفِ نظر سوکھی بھولوں کی سحر
سبزۂ نو ہیں گل و لالہ گلستانوں میں
کوئی پرکیف سی مستی نہیں خمخانوں میں
قصرِ مہتاب نہ خورشید کے کاشانوں میں
دامنِ خار سے اُلجھی ہے یہ پھولوں کی سحر

فضا ابن فیضی

مطبوعات موصولہ

نوائے نے مجموعہ ہے محمد سلیمان صاحب کی ۵۱ نظموں اور چند غزلوں کا جسے جہانگیر پریس گلشن گنج پورینا نے شایع کیا ہے ضخامت ۸۶ صفحات ۔ قیمت عہ

سلیمان صاحب صوبۂ بہار کے ایک معروف شاعر و صحافی ہیں اور ایک خاص حلقہ میں کافی مقبول ۔ ان کے کلام میں کوئی معنوی بلندی یا تخئیل کی ندرت نہیں پائی جاتی، لیکن انداز بیان کی سلاست و روانی کافی دلکشی رکھتی ہے۔

پیش لفظ میں جناب اکمل یزدانی ام۔ اے نے ان کی شاعری کا تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ وہ ایک تعمیر پسند شاعر ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں زمانہ کے موجودہ رجحانات سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ کلام کے مطالعہ سے یزدانی صاحب کے اس خیال کی یقیناً تائید ہوتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس نوع کے تاثرات میں جو جوش و ولولہ پایا جاتا ہے وہ ان کے کلام میں نہیں ہے اور اس لئے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بجائے شعریت کے ناصحانہ کیفیت زیادہ پائی جاتی ہے۔ غزلوں کا حصہ زیادہ پھیکا ہے۔

ڈائن اور دوسرے افسانے مجموعہ ہے شکیلہ اختر کے ۱۲ افسانوں کا جسے مکتبۂ ادب رمنا روڈ پٹنہ نے شایع کیا ہے، ضخامت ۱۴۵ صفحات۔ قیمت عہ۔ کتابت و طباعت غنیمت۔

اس مجموعہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جتنے افسانے پائے جاتے ہیں وہ واقعی عورت کے لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جن میں مردانہ طرز تحریر کی تقلید نہیں کی گئی۔ زبان، تاثرات اور ٹکنک سب میں نسائیت پائی جاتی ہے اور یہ خوبی کم نہیں۔ شکیلہ اختر نے ان افسانوں سے ثابت کیا ہے کہ معاشرہ میں عورت کو جو درجہ ملنا چاہئے اس سے محروم ہے اور اسی لئے وہ بہت سے آلام و مصائب میں مبتلا رہتی ہے۔ اس مقصد کے لئے جو لب و لہجہ اور انداز بیان انھوں نے اختیار کیا ہے وہ بہت موزوں و مناسب ہے اور اسی لئے یہ افسانے مطالعہ کے بعد اک گہرا اثر پڑھنے والے کے دل میں چھوڑ جاتے ہیں۔

عورت قدرتاً زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور اگر اسے اپنے جذبات پر اظہار کی قدرت حاصل ہو تو وہ مردوں سے زیادہ دنیا کو متاثر کر سکتی ہے اس لئے ہمیں امید ہے کہ شکیلہ اختر کی محنت رائگاں نہ جائے گی اور لوگ دردمندانہ حیثیت سے اس کا مطالعہ کریں گے۔

مراثی میر میر تقی میر دنیائے شعر میں جس مرتبہ کے حامل ہیں، کسی سے مخفی نہیں اور اسی لئے لوگوں نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ان کے کلیات میں وہ سب کچھ جمع کر دیا جو انھیں دستیاب ہوا، لیکن ان کے مراثی اس وقت تک سامنے نہیں آئے تھے، اور بعض کتب خانوں ہی میں محفوظ تھے۔

تذکروں سے تو بیشک یہ پتہ چلتا تھا کہ میر نے مرثیے بھی کہے اور بعض نے ایک آدھ بند نقل بھی کئے لیکن ان کے مراثی کا پورا مجموعہ نہ کسی کلیات میں شایع ہوا نہ ان پر کسی نے تبصرہ کیا، اس لئے مسیح الزماں صاحب ام۔ اے کا تلاش و جستجو کے بعد ان مراثی کو خوش ترتیبی کے ساتھ شایع کرنا یقیناً زبان کی بڑی خدمت ہے جس کی قدر ملک کو کرنا چاہئے۔

اس مجموعہ میں ۲۷ مرثیے مربع (دوبیتی) ہیں، ایک مرثیہ مثمن ہے، تین مرثیے مسدس ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ سلام ہیں اور چار قصیدے، اس طرح یہ کل مجموعہ معہ مقدمہ کے ۲۰۸ صفحات کو محیط ہے۔

ہمارے یہاں جس وقت مرثیہ کا ذکر آتا ہے تو بے اختیار ہمارا ذہن انیس و دبیر کی طرف جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اگر انیس کے معیار کو سامنے رکھا جائے تو میر کے مراثی کوئی حیثیت نہیں رکھتے، لیکن اگر آپ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں گے کہ میر کے مرثیے اب سے تقریباً دو سو سال پہلے کی تصنیف ہیں تو ان کی اہمیت ایک مورخ و محقق زبان کے لئے انیس کے مرثیوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

فاضل مرتب نے ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ لکھ کر اُردو مرثیہ کی تاریخ پر جو روشنی ڈالی ہے وہ بجائے خود بڑی مفید چیز ہے، قیمت تین روپیہ - ملنے کا پتہ انجمن محافظ اُردو نیا محل منصور نگر - لکھنؤ -

وجد سکندر علی وجد کے کلام کا مختصر سا انتخاب ہے جسے ٹائپ میں انجمن ترقی اُردو علی گڑھ نے شایع کیا ہے۔ یہ انتخاب چند نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے - انتخاب اچھا ہے، وجد کا کلام پاکیزگی خیال اور حسن ادا کا مرقع ہے غزلیں گو تھوڑی ہیں لیکن تمام کی تمام صاف و سادہ اور دلکش ہیں۔ وجد کی شاعری میں حسن بیان اور حسن خیال کا امتزاج بڑا نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ا-

خوش جمالوں کی یاد آتی ہے　　بے مثالوں کی یاد آتی ہے
جن کی آنکھوں میں تھا سرور غزل　　اُن غزالوں کی یاد آتی ہے
سادگی لاجواب ہے جن کی　　اُن سوالوں کی یاد آتی ہے
جانے والے کبھی نہیں آتے　　جانے والوں کی یاد آتی ہے

اس مجموعہ میں ان کی بہت مشہور نظم اجنتا بھی شامل ہے - حجم ۳۰، صفحات - قیمت تین روپیہ -

ٹوٹ گئی ڈالی یہ کتاب شفیق بانو کے افسانوں کا مجموعہ ہے - ان کہانیوں کا مرکزی خیال عورتوں کی مظلومی و مجبوری اور مردوں کی ستم کیشی و فریب دہی ہے۔ زبان صاف و شستہ ہے - ہر کہانی میں ایک جذباتی ارتعاش ہے جس سے پڑھنے والے پر اثر ہوتا ہے۔ واقعات جس انداز میں بیان کئے گئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں - یقیناً مرد نے ہمیشہ عورت کو ایک کھلونا سمجھا، اس سے کچھ دیر کھیلا جب طبیعت سیر ہوگئی تو پھر اس سے نگاہیں پھیر لیں۔ عورت کے لطیف جذبات کی اب تک اس نے صحیح معنوں میں قدر نہیں کی۔ کہانیوں کا انداز بیان صاف و سلیس ہے۔ مکالمات اچھے ہیں۔ واقعات کو جس ماحول میں بیان کیا گیا ہے وہ بھی صحیح ہیں لیکن افسانوں میں جذباتیت Sentamentalism کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے - جذباتیت کے ساتھ ساتھ فکری وزن کی بھی ضرورت ہے - محترمہ شفیق بانو نے کہیں بھی یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ آخر عورت کے لئے ان مظالم سے نجات کی کیا صورت ہے؟ یہ بات اگر کتاب میں ہوتی تو تعمیری حیثیت سے کتاب نہایت مفید ہوتی - طباعت وکتابت اچھی ہے اور تین روپیہ میں ہوم لائبریری پبلیکشنز اُردو بازار لاہور سے مل سکتی ہے -

ایک اسلام تصنیف ہے ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ اس وقت تک اسلام کو جس طرح پیش کیا گیا ہے وہ یکسر قرآن و تعلیمات قرآن کے منافی ہے - انھوں نے بتایا ہے کہ اسلام کا درس خالص انسانیت پرستی و اخوت عامہ ہے، وہ نہ صرف یہ کہ نسل و رنگ کے امتیاز کا مٹانے والا ہے، بلکہ نفس مذہب کی صداقت کو بھی وہ بہت فراخ نظری سے دیکھتا ہے -

فاضل مصنف نے کرشن، بودھ، گرونانک، وید، گیتا، انجیل، توریت تمام مقدس ہستیوں اور صحیفوں سے بحث کی ہے اور ان سب کی حقیقت و صداقت کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے ایک مستقل باب تعلیمات قرآنی کے لئے وقف کیا ہے جس میں ایمان، توحید، اعمال صالحہ اور صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ کے فلسفہ کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے -

ان کا مقصود اس تصنیف سے یہ بتانا ہو کہ اسلام نام ہے صرف صداقت کا اور صداقت دُنیا میں ایک ہی ہے خواہ وہ کسی ملک اور کسی قوم کے رہبر و مصلح کی زبان سے ظاہر ہو۔

ڈاکٹر صاحب کی وسعتِ نظر اس میں شک نہیں قابلِ داد ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ پاکستان میں جہاں احمدیوں کو بھی غیر مُسلم سمجھا جاتا ہے اس کتاب کو کس نگاہ سے دیکھا جائے گا اور ڈاکٹر صاحب کو اس جرأت کی داد دینا چاہئے کہ باوصف پاکستانی ملازم ہونے کے انھوں نے ایک ایسی کتاب لکھنے کی جرأت کی، جسے مولوی کفر و الحاد کی تبلیغ کے اور کچھ نہیں کہ سکتا

یہ کتاب مجلد نہایت اہتمام سے شایع کی گئی ہے اور کتاب منزل لاہور سے چار روپیہ میں مل سکتی ہے

گاندھی بابا کی کہانی

تالیف ہے قدسیہ بیگم زیدی کی جسے مکتبۂ جامعہ دہلی نے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ یہ کتاب بچّوں، عورتوں اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے نہایت آسان زبان میں لکھی اد. روشن حروف میں چھاپی گئی ہے۔

اس میں مہاتما گاندھی کی زندگی کے خاص خاص واقعات کو کہانی کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور ایسے دلچسپ انداز سے کہ خواہ مخواہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ جابجا تصاویر و نقوش نے اسے زیادہ دلچسپ بنادیا ہے۔ شروع میں جواہر لال نہرو کا پیش لفظ بھی ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کا خیر مقدم کیا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ۔

تذکرہ شعرائے اُردو

از ڈاکٹر عبداللہ صدر شعبہ اُردو پنجاب یونیورسٹی لاہور۔ کاغذ نہایت نفیس، طباعت ٹائپ ناشر:- مکتبۂ جدید لاہور۔

مصنف نے یہ کتاب بڑی خوش اسلوبی سے ترتیب دی ہے۔ ابتدا میں تمام "مرکزی" تذکروں کا ذکر ایک علمی ترتیب سے کیا ہے۔ ہر تذکرے کی خوبیوں اور خامیوں کا بڑی احتیاط سے تجزیہ کیا ہے، میر تقی میر سے لیکر کریم الدین، دتاسی اور مولانا حسین آزاد تک کے تذکروں کا جایزہ لیا ہے۔ قدیم وجدید تذکروں میں اسلوب بیان اور خیالات و رجحانات کے اعتبار سے جو تفاوت ہے اسے بھی بڑی خوبی سے بیان کیا ہے بعد میں "تنقید تذکرہ" کے عنوان سے ایک محاکمہ ہے جو نہایت عالمانہ اور منصفانہ ہے۔ اس محاکمہ میں بڑی احتیاط سے تمام قدیم وجدید اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی علمی ترتیب اور تنقیدی انضباط پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جمالِ فطرت

فکری سلطانپوری کے قطعات کا مجموعہ ہے جسے خود انھوں نے پسندیدہ طباعت و کتابت کے ساتھ سفید کاغذ پر مجلد شایع کیا ہے۔ قیمت چار روپیہ۔ پاکستان میں ۱۲۰ مارٹن روڈ کراچی سے مل سکتی ہے اور ہندوستان میں امیر مرزا صاحب حنا بلڈنگ لکھنؤ سے۔

فکری کی شاعری حُسن کی رنگینیوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ حسن خواہ کسی روپ میں آئے وہ اس کی پرستش کرنے کے لئے طیار ہیں ان کے یہاں افسردگی اور احساس شکست نہیں ہے وہ فطرت کے حُسن، زندگی کے جمال اور محبوب کے جلووں میں کھوئے رہتے ہیں۔ ان کے یہاں مشاہدہ ہے تجربہ ہے اور تیز احساس۔ "زندگی سے بیزاری" ان کے کلام میں کہیں بھی نہیں ملتی۔ لیکن ان کے یہاں عصری میلانات بالکل نہیں ہیں وہ سماج کی پیچیدگیوں سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں ان کے بعض قطعات میں کہیں کہیں عریانی اور سوقیت آگئی ہے۔ ان کے اشعار میں لذتیت پورے طور پر نمایاں ہے جو کہیں کہیں حدودِ لطافت سے گزر گئی ہے۔

رموزِ خطابت

تالیف ہے نذیر الدین احمد صاحب کی جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ خطابت کیا ہے اور اس میں کیونکر کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

خطابت اور شاعری دونوں در اصل وہبی چیزیں ہیں اور اگر کوئی شخص قدرتاً خطیب بننے کی صلاحیت لیکر نہیں آیا ہے تو وہ اچھا خطیب نہیں بن سکتا، لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر وہبی خطیب کامیاب خطیب بن سکے اگر وہ اس فن کو فن کی طرح حاصل نہ کرے۔

نذیرالدین احمد صاحب نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ تقریر کرنے کے لئے مقرر کو کیا طیاری کرنا چاہئے اور اسکی کامیابی کن باتوں پر منحصر ہے، اُردو میں اس موضوع پر بہت کم مواد ملتا ہے اس لئے امید ہے کہ ملک میں اس کی قدر کی جائے گی۔

قیمت عہ، ملنے کا پتہ:- انجمن اشاعت علم و ادب ۲۳۔۷ چیلہ پورہ حیدرآباد (دکن)

گلگونہ مجموعہ ہے جناب محمد یاسین تسکین قریشی کی غزلوں اور چند نعتیہ نظموں کا۔ ابتدا میں حضرت جگر، جناب اثر اور پروفیسر سرور کی رائیں درج ہیں اور ان سب نے جناب تسکین کے کلام کو بالاتفاق سراہا ہے، حالانکہ اس اہتمام کی ضرورت نہ تھی اور جناب تسکین کا کلام بغیر کسی تعارُف کے آپ اپنی سفارش ہے۔

اس وقت غزلوں سے زیادہ نظموں پر توجہ کی جاتی ہے اور جناب تسکین نے نظمیں بھی کافی کہیں اور خوب کہیں، لیکن میرے نزدیک ایک شاعر کا صحیح مرتبہ اس کی غزل ہی کو دیکھ کر کیا جاسکتا ہے اور اس لحاظ سے میں جناب تسکین کو اس وقت کا نہایت اچھا غزلگو شاعر سمجھتا ہوں۔ ذیل کے چند اشعار سے ہر شخص ان معیار تغزل کا اندازہ کرسکتا ہے:۔

کچھ اور پوچھئے، یہ حقیقت نہ پوچھئے　　کیوں مجھ کو آپ سے ہے محبت نہ پوچھئے

نہ جانے محبت میں کیوں ہیں ضروری　　وہ کچھ حسرتیں جو کبھی ہوں نہ پوری

مجھے عزیز سہی خاک دل مگر یہ کیا　　تمھیں نے آگ لگائی، تمھیں بجھا نہ سکے
وہ کیا کریں گے مداوائے دردِ دل تسکیںؔ　　جو اک نگاہ محبت کی تاب لا نہ سکے

تم دے گئے ہو تنہائی دل،　　تم کیا گئے ہو، خلوت نہ محفل

عشق سے پہلے نہ سمجھے تھے خوشی ہوتی ہے کیا　　کیوں چمکتے ہیں ستارے چاندنی ہوتی ہے کیا

کوئی ہنستا ہے کوئی رو رہا ہے　　یہ آخر کیا تماشہ ہو رہا ہے
محبت میں کسی کی کیا شکایت　　جو ہوتا آرہا ہے، ہو رہا ہے

کیا زندگی کا احساس کامل،　　تیرے بغیر اے غارتگرِ دل،
لب پر تبسم آنکھوں میں آنسو،　　ہم لکھ رہے ہیں افسانۂ دل،

اس قسم کے سرتیز نشتروں سے یہ مجموعہ بھرا پڑا ہے۔

یہ مجموعہ نہایت اچھی طباعت و کتابت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے اور عہ میں مکتبۂ جامعہ دہلی سے مل سکتا ہے

بین الاقوامی سوشلزم رسالہ ہے ضیاء الحسن فاروقی ام۔ اے کا لکھا ہوا جس میں انھوں نے سوشلزم کی ابتداء اور اس کی تدریجی ترقی کی تاریخ نہایت احتیاط و خوبی کے ساتھ پیش کی ہے۔

جناب فاروقی بڑے کامیاب و تجربہ کار صحافی ہیں، اس لئے ان کی یہ کوشش ایک "کار آگاہانہ" کوشش ہے اور ان تمام خامیوں سے پاک ہے جو ایک Layman کی کتاب میں پائی جاتی ہیں۔

قیمت آٹھ آنے، ملنے کا پتہ:- دفتر مدینہ بجنور

آہنگ مجموعہ ہے جناب مجازؔ کی نظموں اور غزلوں کا جسے آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی سے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے اس وقت کے نوجوان ترقی پسند شعراء میں سب سے کم ترقی پسند میری نگاہ میں مجازؔ ہیں اور یہ میں نے اس لئے

کہا کہ ان کی نظموں کا پس منظر بھی کلاسکل خصوصیات سے معرا نہیں ہوتا، چہ جائیکہ غزلیں کہ وہ تو تغزل کی تمام خصوصیات سے معمور ہوتی ہیں۔

مجاز کے کلام کی وہ خصوصیت جو انھیں دورِ جدید کے شعراء سے ممتاز کرتی ہے، اس کا غنائی لب و لہجہ اور بیساختہ پن ہے۔ ان کے کلام کا عنصر غالب سلاست و روانی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو اکتساب سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض ذوق و وجدان سے پیدا ہوتی ہے۔ قیمت للعہ

کمار سمبھو

اُردو ترجمہ ہے کالی داس کی مشہور نظم کمار سمبھو کا جسے بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے اُردو میں پیش کیا ہے۔ کالی داس جس مرتبہ کا شاعر تھا ظاہر ہے، اور اس لئے اس کے کلام منظوم ترجمہ کسی معمولی شاعر کا کام نہ تھا لیکن جناب منور لکھنوی اس منزل سے جس قدر کامیاب گزرے ہیں اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کالی داس کے بلند خیالات اور اس کی شاعرانہ خصوصیات کو جس حسن و خوبی کے ساتھ اُردو نظم میں پیش کیا گیا ہے وہ نہ صرف انتہائی مہارت بلکہ حد درجہ پاکیزہ ذوق چاہتا تھا۔

جناب منور لکھنوی سرزمین لکھنؤ سے تعلق رکھتے ہیں اور منشی دوارکا پرشاد افق کے فرزند ہیں جنھوں نے رامائن اور مہا بھارت وغیرہ کے نہایت کامیاب ترجمے کئے تھے۔ منور صاحب کو یہ ذوق اپنے والد سے ورثہ میں ملا ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس ورثہ سے انھوں نے خود بھی پورا فایدہ اُٹھایا اور دوسروں کو بھی مستفید کیا۔ یہ کتاب انجمن ترقی اُردو بک ڈپو دہلی نے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول۔

مراثی شاد

مجموعہ شاد عظیم آبادی کے پانچ مرثیوں کا جنھیں جناب حمید عظیم آبادی نے شایع کیا ہے، شاد غزل گو ہونے کی حیثیت سے جس مرتبہ کے شاعر تھے وہ کسی سے مخفی نہیں، لیکن یہ علم بہت کم لوگوں کو تھا کہ انھوں نے مرثیے بھی کہے اور ایسے معرکہ کے کہ ان کو دیکھ کر انیس کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ ضرورت تھی کہ ان مرثیوں کو شایع کرکے جناب شاد کی اس شاعرانہ خصوصیت کو بھی سامنے لایا جاتا۔

اس مجموعہ کا حجم ۱۷۲ صفحات ہے اور قیمت پانچ روپیہ جو یقیناً بہت زیادہ ہے۔ معتمد بزم شاد، حمید منزل پٹنہ سے خط و کتابت کی جائے۔

آج کے نغمے کل کے شعلے

مجموعہ ہے عظیم قریشی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی نظموں کا جسے ملک دین محمد اینڈ سنز اشاعت منزل لاہور نے نہایت اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے۔

جناب عظیم قریشی پنجاب کے جدید شعرا میں سے ہیں اور خیال و ٹکنک کے لحاظ سے بڑے آزادہ رو اور ندرت پسند۔ انکے نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ تجرباتی دور سے گزر رہے ہیں، اور ممکن ہے ان کی جودت و ذہانت انھیں اس منزل سے کامیابی کے ساتھ لے جائے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

آکاش وانی دکھیا سنسار

یہ ڈائری ہے جناب کندن کی جس میں انھوں نے اپنے تاثرات "خیالات پریشاں" کی صورت میں یکجا کردئے ہیں۔

ان خیالات کا تعلق بالکل اصلاح تمدن و معاشرت سے ہے اور ان کے ذریعہ سے انسانیت پرستی اور اخوت عامہ کی تعلیم دی گئی ہے جس کی آجکل سخت ضرورت ہے۔ یہ خیالات کسی ایک وقت یا مقام کے تاثرات سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ مختلف اوقات و مقامات میں جو کیفیات، کندن صاحب کے دل و دماغ میں پیدا ہوئے انھیں یکجا کردیا گیا ہے۔ بعض تاثرات صرف اقوال کی حد تک مختصر ہیں لیکن روح ان سب کی ایک ہی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آج کل جبکہ دنیا کا امن و سکون خطرہ میں ہے اور ہر متنفس اس کی جستجو میں سرگرداں ہے، یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔

قیمت دو روپیہ، ملنے کا پتہ:۔ ۲۸/۳۴ راجندر نگر، شنکر روڈ۔ نئی دہلی۔

علم شہریت اور نظام حکومت

جناب ابراہیم عمادی کی تصنیف ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے پہلا حصہ موضوع "Civics" کے لئے وقف ہے جس کا ترجمہ انھوں نے شہریت کیا ہے (حالانکہ مدنیت یا بلدیت زیادہ موزوں ترجمہ تھا) دوسرے حصہ میں ایڈمنسٹریشن (نظام حکومت) سے بحث کی گئی ہے۔

حصۂ اول دس ابواب پر مشتمل ہے جن میں شہری ہونے کے مفہوم اور اس کے حقوق و فرائض سے بحث کی ہے، دوسرے حصہ میں بارہ ابواب ہیں جن میں دستور ہند کی تدریجی ترقی اور اس کے نئے دستور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے حد درجہ مفید ہے اور اب کہ ہندوستان آزاد ہو چکا ہے اس کے ہر ہر فرد کو سمجھنا چاہئے کہ ایک آزاد شہری ہونے کی حیثیت سے ایک جمہوری حکومت میں اس کا صحیح موقف کیا ہے، اس کے حقوق فرائض کیا ہیں، اور حکومت سے وہ کیا مطالبات کر سکتا ہے۔

اس کتاب میں ہندوستان کے نئے دستور پر خاص زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کا مطالعہ بھارت کے ہر باشندہ کے لئے ضروری ہے۔

یہ کتاب نہایت آسان و سلیس عبارت میں لکھی گئی ہے جس سے نہ صرف طلبہ بلکہ پڑھے لکھے عوام بھی فایدہ اٹھا سکتے ہیں، یہ کتاب عثمانیہ کتب خانہ بمبئی (۳) سے ڈھائی روپیہ میں مل سکتی ہے۔

قمر شیروانی:۔

کبھی آشیاں کی تمنا، مسلسل! — کبھی آشیاں تک گئے، لوٹ آئے

کچھ ایسی بھی خنک راتیں رہی ہیں — سحر تک بس تری باتیں رہی ہیں

تجھے دیکھا نہیں ہے، پھر بھی تجھ سے — مری اکثر ملاقاتیں رہی ہیں،

جینے والوں کو کیا خبر اس کی — مرنے والے کدھر سے گزرے ہیں

گلہ ہے گا ہے تو ہوش والوں پر، — ہم بھی دیوانہ وار ہنستے ہیں

پھر بہاروں کا تذکرہ ہے قمر — پھر گریباں کے تار ہنستے ہیں

اُن سے قمر کیا شکوہ کیجے — ہم پر خود الزام بہت ہیں

غم دئے کائنات نے کیا کیا — نام بدلے حیات نے کیا کیا،

رنگ دیکھے مری تباہی کے — آپ کے التفات نے کیا کیا

مجھ کو مارا ہے ہر قدم پہ قمر
ایک جینے کی بات نے کیا کیا

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

اڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان اڈیشنوں میں پہلے اڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ طباعت ہوئی ہے قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اسکی زبان و تخیل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ اڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے

قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

جذبات بھاشا

جناب نیاز نے ایک عجیب تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کرکے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں بھی یہ پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں:-

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادیین کا مذہب

نہایت مفید و عجیب کتاب ہے۔

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کا بعنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اسکے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور افکار کے لحاظ سے اسقدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ اڈیشن نہایت صحیح و خوشخط، سرورق رنگین

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

فراست الید

مولفہ نیاز فتحپوری۔ اسکے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہے۔

قیمت ایک روپیہ

علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ و انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخر تک پڑھ لینا ہے یہ بھی جدید اڈیشن ہے جس میں صحت اور نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت

ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ۔ اردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی نقشہائے رنگ رنگ، غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ ادبیات اور اصول نقد فنون و حقیقت نگاری

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآراء مقالہ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا۔ اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کرسکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے

قیمت

ایک روپیہ

علاوہ محصول

REGD NO. A 465

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شایع کیا گیا ہے مومن کے مطالعہ کیلئے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

فروری - مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

جو نقد و نظر پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہو تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شایع کیے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری، فروری سنہ ۱۹۵۰ء

نگار کی ۳۰ سالہ ادبی و تنقیدی خدمات کا نچوڑ جس میں سنہ ۱۹۲۲ء سے لیکر سنہ ۱۹۴۹ء تک کے تمام تنقیدی رجحانات اقتصادی نمونوں کو واضح کیا گیا ہے اس میں بعض ایسے اکابر شعرا کا تذکرہ و انتخاب کلام بھی شامل ہے جن کے حالات عام طور پر معلوم نہیں ہیں اور جن کا کلام نایاب ہے۔ اس میں جدید تنقیدی میلانات اور ترقی پسند نقادوں کے مقالات بھی شامل ہیں۔

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

جنوری سنہ ۱۹۵۱ء

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں مارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب "ایک مستقبل کی تلاش" کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپیہ

۵۵ سال کے بعد

یہ کتاب نفسیات عملی پر اتنا مفید و دلچسپ لٹریچر ہے کہ آپ اسکو ایکبار ہاتھ میں لینے کے بعد اسوقت تک چھوڑ ہی نہیں سکتے جب تک ختم نہ کرلیں۔ یہ کتاب آپ کو بتائے گی کہ "زندہ رہنا بھی ایک فن ہے"

قیمت ایک روپیہ بارہ آنے

سالنامہ سنہ ۵۲ء

(حسرت نمبر) جس میں ملک کے تمام اکابر نقادوں نے حصہ لیا ہے۔ اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپکو کلیات حسرت دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لئے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۵۳ء

(داغ نمبر) جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، قیام ... اور انکے فن شعر گوئی پر بھی ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے قیمت دو روپیہ